شب زندگی

(حصہ دوم)

از

مصور غم علامہ راشد الخیری

پہلا ایڈیشن

قیمت ~~دو روپے~~

REVISED PRICE

3/2 ....

پبلشر

عطاء الرحمان صدیقی منیجر پیام مشرق بکڈپو

جامع مسجد دھلی

اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

(۱)

رمضان شریف کی اس رات کو جو لیلۃ القدر کے نام سے مشہور ہے آسمانی دنیا میں عجیب چہل پہل ہوئی۔ صبح ہی سے یہ اعلان ہو چکا تھا کہ آج مقدس روحیں درگاہِ ربّ العزّت میں پیش کی جائیں گی۔ اور یہ وہ پاک انسان ہوں گے جن سے بہتر اور کوئی روح اس سال آسمانی دنیا پر نہیں پہونچی۔ جنت آراستہ کر دی گئی تھی۔ قصرِ زمردین جن کے درو دیوار لعل و یاقوت سے مزین تھے ہیرے اور موتیوں سے جگمگا رہے تھے۔ حوریں بناؤ سنگار کئے وقت کی منتظر تھیں۔ ملائکہ دست بستہ چاروں طرف کاروبار میں مصروف تھے۔ خوش رنگ پھول، سدا بہار بیلیں، دودھ اور شہد کی نہریں۔ خوش الحان طائر، سر سبز گھاس، بار آور درخت غرض فردوس بریں کا ہر ذرہ قادرِ مطلق کے گیت گا رہا تھا۔

جب انسانی دنیا کا آفتاب غروب ہو چکا اور رات سر پر چھا گئی اور مسلمان سحری سے بھی فراغت پا چکے تو ایک نورانی فرشتہ سبزہ زار میں آکر کھڑا ہوا۔ مرد اور عورتوں کی تمام جنتی روحیں اپنے اپنے محلوں سے باہر نکل کر آج کا جلوس دیکھنے کی مشتاق تھیں اور منتظر تھیں کہ اس انتخاب میں کس کس کے اعمال داخل آتے ہیں۔ اور وہ کون سی خوش نصیب روحیں ہیں جن کو اعزاز خصوصی نصیب ہوتا ہے کہ فرشتہ نے سب سے پہلے کلمۂ توحید پڑھا۔ اور اس کے بعد بآواز بلند کہا:۔

"افسوس ہے کہ گذشتہ پانچ سال سے نسوانی روحوں کی تعداد اس اعزاز میں بہت کم ہے۔ سال گذشتہ میں تینوں مردانہ روحیں تھیں۔ آج صرف ایک عورت بھی اعزاز میں شریک ہے جس کو درگاہ ایزدی میں باریابی ہوگی۔"

اتنا کہہ کر فرشتہ نے حوروں کے ایک پرے کی طرف اشارہ کیا اور وہ سب ایسے محل کے آگے جمع ہوئیں جس کی چمک، دمک اور آب و تاب باقی محلوں کو مات کر رہی تھی۔ یہاں ایک جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر سونے چاندی کے حرفوں سے "کامیاب زندگی" لکھا ہوا تھا۔ جتنی روحوں کی نظر ابھی ان حروف ہی پر تھی کہ ایک عورت انواع واقسام کے بیش بہا زیوروں اور بے نظیر زرق برق دیبا و حریر سے آراستہ پھولوں میں لدی، عطر میں بسی، دلہن بنی اس طرح آئی کہ حوریں اس کی جلو میں باادب حاضر تھیں۔ فرشتہ نے تعظیم کی گردن اس کے روبرو خم کی اور کہا:۔

"فردوس بریں کی بسنے والی روحو! تم سب متعجب ہو کہ وہ کیا چیز تھی۔ جس نے اس عورت کو اس درجہ تک پہونچایا اور آج اس کا جلوس اس شان سے نکل رہا ہے کہ آسمان کے فرشتے اور جنت کی روحیں اس کی خدمت گزار ہیں! تم متحیر ہو۔ کانوں نے فانی زندگی میں جو سنا مرنے کے بعد آنکھ سے وہ دیکھ لو، تم تک یہ پیام پہنچ چکا ہے کہ زمینی دنیا کی لاچار مخلوق آسمانی بستی کی بااختیار بادشاہ ہے۔ اس وقت اس کی تصدیق کرو اور دیکھو کہ کیچڑ میں موتی اور گودڑ میں لال کس طرح چمکتے ہیں۔

"یہ ایک خوش حال باپ کی بیٹی اور متمول شوہر کی بیوی ہے۔ ماں کی اکلوتی بچی ہی نہیں عمر بھر کی کمائی یا زندگی کا اثاثہ صرف یہی صورت تھی، تم سب خود انسان ہو اور انسانی عادت سے کما حقہ واقف۔ سمجھ لو کہ بلقیس کا کوارپنا کیسا گذرا ہوگا۔ اس نے کچھ اپنی خوبیوں اور نیکیوں کی وجہ سے نہیں والدین کے تمول اور خلق کی بدولت محلہ بھر پر راج کیا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس حکومت میں صداقت نہیں تھی۔ خوشامدیں فرضی تھیں، دعائیں جھوٹی تھیں اور محبتوں کا سلسلہ جو رنگ برنگ کے لباسوں میں لامتناہی تھا۔ حقیقتہً حاجتمندوں کی ضرورت تھی، ورنہ ٹوٹنے والی بیوہ جو اس کی حالت مرض میں زبان سے یہ کہہ رہی تھی کہ:۔

"الٰہی اس کا بخار مجھے چڑھ آئے اور یہ بیگم تندرست ہو جائے" دل میں اس واقعہ

کو بھی لیے ہوئے تھی کہ کس بے رحمی سے اس نے آج صبح میرے بچہ کو تخت پر سے دھکا دیا اور وہ لہولہان ہو گیا۔ قدرت کی وہ زبردست ترازو جو انسان کے ہر قول و فعل کو پرکھ رہی ہے بلقیس کے اس دور سے بے خبر نہ تھی، مگر بچی، عمر کی کچی، رائے صاحب نہ قیاس درست اچھے اور برے دونوں عمل بچپن کی آغوش میں آرام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وقت نے کوارپتہ کی گہری نیند سلا کر جوانی کا بیش بہا جھومر ماتھے پر لگایا اور ماں کی پیاری ایک متمول تاجر کی راج دلاری بن کر گھر کی ملکہ ہوئی۔

جس لڑکی نے میکہ میں تراہ تراہ مچا رکھی تھی۔ لونڈیاں حیران، مامائیں پریشان، کوئی رو رہی ہے کوئی جھینک رہی ہے۔ وہ سسرال پہنچ کر گھر بھر کی انگوٹھی کا نگینہ نکلی جھنتی رو حوں نعجب نہ کرو۔ کوارپتہ کی بے فکری اکثر لڑکیوں کو چونچال رکھتی ہے مگر خوش نصیب ہیں وہ ماں باپ جن کی صحبت اور تربیت معصوم دلوں میں ایسے بیج بو دے کہ عہد شباب میں ان سرسبز درختوں کا سایہ ایک دنیا کو سیراب کرے۔ بلقیس کے ماں باپ بچی کی نازبرداری ضرور کر رہے تھے اور کر کیا رہے تھے۔ زندگی کا اثاثہ ایک وہی تھی۔ لیکن اس شفقت اور محبت کے ساتھ کہ بظاہر اندھے اور بہرے تھے۔ بہ باطن کچھ سن اور دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے خدا کا خوف، رسولؐ کی عظمت و انسانی ہمدردی تین جواہر ایسے دل نشین کر دیے تھے کہ بلقیس جوان ہوئی تو ایسی کہ تینوں صفتوں سے مالامال تھی۔

بلقیس کا جیٹھ حسن اور دیور حسین دونوں مشہور تاجر تھے۔ مگر حسن کی بیوی نے مر کر بڈھے کی زندگی تلخ کر دی۔ حسن تینوں بھائیوں میں بڑا اور ساٹھ برس کا آدمی تھا مگر امیر کا لڑکا۔ خود امیر۔ کھاتا پیتا، فکر، غم سے دور اور رنج سے الگ۔ ایک فیل کا فیل اور شبر کا شیر تھا۔ بیوی کی موت کیا تھی کی چوٹ تھی برداشت کرنے کی وجہ اور موت پر رونے کا سبب ۹ مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو کڑی اٹھائی اور مصیبت بھگتی۔ مگر اس کے بعد صبر کی طاقت نہ انتظار کی ہمت دھڑتے سے دوسرا نکاح کیا اور گھر بسایا تو بیٹیوں ہی کے ماں باپ سمجھ سکتے ہیں کہ لڑکی کا نبھنا

کس قیامت کا سامنا ہے۔ عمریں ڈھل رہی ہیں۔ وقت گذر رہے ہیں۔ مگر بدنصیب نہیں حسن میں سوائے اس کے کہ بڈھا تھا اور کیا خرابی تھی۔ دولت نے اس خرابی کو خوبی سے بدل دیا۔ اس کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی۔ بیٹی والے پروانوں کی طرح گرے۔ ہر باپ تو کم مگر ہر ماں یقینی خواہش مند تھی۔ سامی تھی۔ منتظر تھی کہ ہمارا مقدر جاگے اور ہماری بیٹی کا نصیبہ کھلے قصہ کوتاہ ایک جگہ بات ٹھہر گئی۔ خدا بھرتے ہی کو بھرتا ہے۔ ٹکر برابر کی تھی۔ لڑکی بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ شادی رچی۔ بڑے میاں دولھا بنے۔ حسن بڈھا تھا تو زلیخا والوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی کنواری بچی کا ایک ارمان، ایک رسم، ایک خواہش کم کرتے۔ ارمان برآئے، خواہشیں پوری اور رسمیں ادا ہوئیں۔ اور اس طرح کہ جوان دولھا اور نوعمر لڑکے بھی مات کئے! حسن کے فعل نکاح پر اعتراض نہیں۔ کیا، خوب کیا۔ زلیخا کے والدین لاریب مورد الزام ہیں۔ نکاح کرتے، کرنا چاہئے تھا۔ کرتے ضرور کرتے۔ مگر یہ نکاح اونٹ کے گلے میں بلی۔ یا شیر کی گردن میں چوہا تھا۔ لاکھ ساٹھا اور پاٹھا سہی، مگر کجا ساٹھ برس کا حسن اور کہاں چودہ برس کی زلیخا! سلوک ظاہر، نتیجہ روشن اور محبت صاف تھی۔ حسن شوہر نہیں غلام تھا کہ زلیخا کے ادنیٰ اشارے پر پتلی کی طرح ناچتا دولت پانی کی طرح بہتی اور اشرفیاں کوڑیوں کے مول لٹتیں۔ زلیخا اور ایک زلیخا ہی نہیں زلیخا اور زلیخا کے ماں باپ دونوں متمنی تھے کہ کسی طرح ایک بچہ پیدا ہو جائے جو اس دولت کا وارث ہو۔ قدرت کا اس تمنا کے پورا کرنے میں کیا نقصان تھا۔ پہلے ہی سال چاند سی لڑکی پیدا ہوئی اور اس دھوم کا عقیقہ ہوا کہ والیان ریاست کے تزک و احتشام بھی گرد ہو گئے۔

زلیخا کے منہ پر اگر آنکھیں، اس کے ماں باپ کے دماغ میں اگر بھیجا ہوتا تو وہ دیکھتے اس مصیبت کو جو اس عشرت کی تہ میں منڈلا رہی تھی۔ سمجھتے اس آفت کو جو اس راحت سے ہم آغوش تھی اور پہچانتے اس اذیت کو جو اس راحت کا انجام تھی۔ مگر افسوس زلیخا اور اسکی ماں دونوں نتیجہ سے بے خبر اور انجام سے ناآشنا تھے، ایسے فکھ لٹ بنے کہ لکھو کھا روپیہ کا مال اور جائداد دل

کے ارمان پورے کرنے میں گنوا دی! پھر حسن اتنا بڑا تاجر اور دولتمند رئیس تھا کہ ان پیہم فضول خرچیوں پر بھی بچا یا روپیہ اس کے پاس اب بھی دونوں بھائیوں سے کم نہ تھا۔ مگر اس کا علاج لقمان کیا کسی کے پاس بھی نہ تھا کہ صرف فاطمہ کے نکاح پر جو حسین کے لڑکے سے ہوا۔ حسن اور زلیخا دونوں اماں باوا نے متفق الرائے ہو کر سونے چاندی کی گنگا جمنی تشتریوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ چالیس روز تک تورہ بندی رہی اور یہ عمر بھر میں پہلا موقع تھا کہ حسن نے نصرف اس لیئے کہ بیوی کی آنکھ اور دل پر میل نہ آئے منجھلے بھائی یعنی بلقیس کے شوہر سے پچیس ہزار روپیہ قرض لیے۔ یہ سلسلہ لامتناہی تھا۔ شروع ہونے کی دیر تھی ایسا چکر پڑا کہ پھر حسن نہ پنپ سکا اور اسکی عمر کے ساتھ ہی نہ صرف جمع پونجی کا خاتمہ ہوا۔ بلکہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا قرض نکلا

اب زلیخا اور اس کی ماں دونوں کی آنکھ کھلی۔ بھائیوں کی عنایت تھی کہ بھائی کے بعد اس کی بیوی اور بچی کو اپنا سمجھا اور اس کے گزارے کا معقول انتظام کر دیا۔ مگر زلیخا کے حوصلے بڑھے ہوئے لپکے پڑے ہوئے، اس عنایت کو خاطر میں کیا لاتی۔ شوہر قرضدار مرا۔ ایک پیسہ کا مال چھوڑا نہیں بھائیوں نے دنیا دکھاوے کو، مردہ بھائی کی لاج کو، باپ دادا کے نام کو غرض کسی وجہ سے اس کے اخراجات کا انتظام کر دیا۔ ضرورت تھی اور ضرورت ہی نہیں انسانیت کہ دیور دل کا عطیہ سر آنکھوں پر رکھتی مگر ایسی محسن کش اور اتنی خود غرض نکلی کہ اپنا حق ہی پیٹتی رہی اور علی الاعلان کہا۔ عورتوں کے مجمع میں کہا۔ برادری کے منہ پر رکھا کہ "دیتے ہیں تو کچھ احسان کرتے ہیں؟ میرا حق بھی ہے یا نہیں؟"

شدہ شدہ یہ خبریں حسن اور حسین دونوں کے کانوں تک پہنچیں۔ فرشتے نہیں انسان تھے اپنے کان سے سنیں، ہاتھ کھینچ لیا اور بے رُخی شروع کی۔ چاہیئے کہ زلیخا اپنی غلطی پر نادم اور بے وقوفی پر متاسف ہوتی۔ مطلق نہیں۔ عاقبت اندیش ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ دگنی پھیلی اور چوگنی اکڑی۔ جس سے کی شکایت اور جس سے کہا بُرا۔ دونوں بھائی بدبخت کی صورت سے بیزار ہو گئے اور اب وہ وقت آیا کہ زلیخا ایک معمولی مکان میں پرے محلے جا کر بسی۔

گو مفلسی نے زلیخا کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مگر تیہا اب بھی وہی تھا۔ بلکہ اس سے دگنا پکار

پکار کر کہتی کہ حسین کو ایسا بیڈھا کروں کہ عمر بھر یاد کرے۔ بہتر ہزار دفعہ ناک رگڑ والوں، جب کہیں فاطمہ کو وداع کروں "

پورا ایک سال زلیخا کا اسی طرح بسر ہوا اور اس عرصہ میں جو کچھ حسن کی کھرچن رہ گئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اماں، بادام چکے تھے۔ اسباب گیا، زیور بکا، برتن گئے۔ غرض کورے گھڑے میں چھارہ گیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زلیخا نے اپنے ساتھ اپنی عقل سے، اپنی جہالت سے اپنی طبیعت سے بچی کی وہ مٹی پلید کی کہ الہٰی توبہ! فاطمہ اب بچہ نہ تھی کہ ان معاملات کو نہ سمجھ سکتی ہو وہ دیکھ بھی رہی تھی اور سمجھ بھی کہ بیوقوف ماں اپنے ساتھ مجھے بھی تھنروں کے بیچوں پہنچا رہی ہے۔ اول اول چند روز خاموش رہی۔ مگر ایک موقع پر جب بلقیس نے رشتہ ناتا سمجھ کر نہیں محض غریب اور حاجتمند سمجھ کر سو آم بھیجے اور زلیخا نے یہ کہکر لانے والی کو دھتکار دیا کہ:۔

" اٹھا ان آموں کو۔ میں کیا فقیر ہوں؟ بھیک مانگونگی تو دوسری جگہ مانگ لوں گی "

تو اس کو کہنا پڑا " اماجان رکھ لیجیے۔ اس میں بھیک کا کیا ذکر ہے "

مگر زلیخا کیا ماننے والی عورت تھی۔ دس بیس باتیں سنا، آموں کی سینی انگنائی میں پھینک دی۔

دولتمند اور لامذہب لوگوں میں نکاح کا قائم رہنا اور ایسے حالات میں، مشکل سے ممکن تھا حسین بھائی کے مرتے ہی اپنی طرف سے اس تعلق کو جھوڑا سمجھ چکا تھا۔ بھاوج کے افلاس نے رہی سہی امید ختم کی۔ اور اب یہ منہ زوری، مرے پر سو دُرّے تھے۔ زلیخا اپنی طرف سے نکاح کو خدا معلوم کو ہ گراں سمجھ بیٹھی تھی یا قانونِ قدرت کہ جنبش ناممکن تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال گزرا ہی نہیں کہ مسلمان نکاح تو درکنار وداع تک طاق میں رکھنے والے لوگ ہیں۔ فاطمہ سترہ سال کی ہو گئی اور یہی زلیخا ان ہی امیدوں میں مست رہیں کہ آج حسین نے آکر قدموں میں سر رکھا اور کل رکھا۔

ماں کی طرح فاطمہ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھنے والی نہ تھی۔ مگر یہ امید اس کو تھی کہ حقیقی چچا، سگے بھائی کے بعد ایسا کتر ہو جائے گا کہ زبان کا پاس، قول کا لحاظ سب

خاک میں ملا کر نکاح شرعی ملیامیٹ کر دے اور بچی جو نکاح کے وقت بلاغ باغ اور نہال نہال تھی۔ ایسی سنگ دل ہوگی کہ ایک بن باپ کی بچی کی عمر کا برباد کرنا اس کا مقصد خاص ہوگا۔ وہ ماں سے کچھ نہ کہتی تھی۔ مگر اندر ہی یہ فکر اس کی جان گھلا رہا تھا۔ عمر کا یہ لمحہ اب اس کو ایک سال سے کم نہ تھا۔ فاقہ فقر۔ تنگی ترشی ہر تکلیف اس کے سامنے گردتی۔ ہر وقت خاموش رہتی۔ مگر اپنی تقدیر پر غور کرتی۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے چند باتیں ماں سے کر لیتی ہو۔ ورنہ وہ تھی اور عمر آیندہ کا فکر۔ اس کی تعلیم و تربیت میں باوجود اس ناز و نعم اور فریفتگی کے کہ سر میں درد ہوتا تو اشرفیاں ٹٹتیں۔ کسر نہ ہوئی، گو ناعاقبت اندیش باپ اور بے وقوف ماں کی بدولت فاطمہ کا یہ حشر کہ سیجوں پر سونے والی کانٹوں سے پٹ گئی علیحدہ چیز ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ اس مصیبت میں بدنصیب تعلیم کے ایسے زیور سے جگمگا رہی تھی جس کو فنا نہیں۔

زلیخا کی مالی حالت بدتر ہوتے ہوتے اب یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ پر تکلف دسترخوان کی بجائے معمولی کھانا اور نفیس لباس کے بدلے غریبانہ موٹے کپڑے رہ گئے، وہ بھی خدا بھلا کرے اس فرشتہ غیبی کا جس نے دیا اور یہ نہ کہنے دیا کہ کس نے دیا اور کیوں دیا۔

زلیخا جس طبیعت کی عورت تھی، اس کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مگر تعجب کم اور افسوس زیادہ حسین کی بیوی تو فقیر پرے، عورت ذات، ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں آگے! دولت کے زعم میں ایسی جانور بنی کہ انسانیت کے تمام جوہر خاک میں ملا دیئے! ضرورت تھی کہ زیور میں لد کر گوندنی کی طرح جھکتی۔ جٹھانی کے اعمال سے سبق لیتی۔ مگر واہ ری دنیا۔ اپنے ہی جیسی عورت آنکھوں کے سامنے بن کر بگڑ رہی ہے۔ سونے روپے والے ہاتھ کوڑیوں کو ترس رہے ہیں۔ مگر تیری دلچسپیوں نے کچھ ایسے پردے ڈال رکھے ہیں کہ روشن آنکھیں اندھی ہیں اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

زلیخا کی جہالت اور بے وقوفی کے ساتھ ہی اس کی حالتِ زار کی خبریں فقیر کے کان تک برابر پہونچ رہی تھیں اور وہ یہی نہیں کہ اپنے دل میں ہی فیصلہ کر چکی تھی، بلکہ میاں سے

صاف صاف کہہ چکی تھی "احسان کو زہر دے دوں گی۔ مگر فاطمہ سے شادی نہ کروں گی"
حسین، حسن ہی کا بھائی تھا۔ بھاوج کی زبان درازی اور افلاس کے پیش نظر بیوی کا
سے کیوں بگاڑتا۔ مگر یہ انسانیت تھی۔ جس سے حیوانیت ہزار مرتبہ ارفع اور لاکھ درجہ اعلیٰ۔
مقابلہ میں ایک معصوم بچی، جس کی دنیا اور دین، جس کی موت اور زیست، جس کی کامیابی و
ناکامی کا انحصار اس تعلق پر تھا۔ سنگ دل چچا اگر غور کرتا اور زیادہ نہیں صرف چند لمحہ کو کھڑے
کھڑے بھاوج کے گھر آجاتا تو اس کی آنکھیں ایک ایسی تصویر دیکھتیں جس کی آنکھیں آٹھ آٹھ
آنسو رو رہی تھیں! ایک ایسی ہستی سے دو چار ہوتیں جس کو وقت نے پتھر سے زیادہ بے حس
کر دیا تھا! ایک ایسی لڑکی سے ملتیں جو مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی! جس کے درد کا علاج
جس کے مرض کی شفا، جس کی اذیت کا چارہ اس کے ہاتھ میں تھا۔
الحق کہ زلیخا کی چوکھٹ سے وداع ہونے والی دلہن مفلس تھی لیکن اس کا سینہ بیش بہا
دولت سے جگمگا رہا تھا۔ روپیہ حسین کے اپنے پاس کچھ کم نہ تھا۔ احسان دولت سے اور فاطمہ
علم سے، دونوں میاں بیوی، فانی اور باقی دولتوں سے مالا مال تھے حسین گھاٹے میں نہ
رہتا مگر منہ پر آنکھیں نہ دل میں درد۔ میاں بیوی نے فیصلہ کر لیا کہ شادی دوسری جگہ ہو۔

(۲)

سہ پہر کا وقت تھا۔ فاطمہ ایک ٹوٹی سی چارپائی پر خاموش بیٹھی تھی۔ فکر آئندہ میں
عہد گذشتہ کی مسرتیں اس کے روبرو دیکھیں۔ اس کو اب تک علم نہ تھا کہ وقت نے اس کی تقدیر
کا کیا فیصلہ کیا اور اس کی تمام توقعات ظالم چچا اور سنگدل چچی کے ہاتھوں ختم ہو گئیں۔
اس کے سامنے باپ کی زندگی کا وہ پُر لطف منظر تھا جب دنیا اس کے آگے آنکھیں بچھا رہی تھی
روپیہ کی ریل پیل تھی، خوشامدیوں کا مجمع تھا۔ نوکروں کی کثرت تھی۔ دولتمند باپ معمولی سے
اشارے پر ہزاروں روپے قربان کرنے کو موجود، معزز چچا ایک چھوڑ دو دو۔ ادنیٰ ضرورت پر جان
لڑانے کو تیار! فاطمہ ان ہی خیالات میں غرق تھی کہ دماغ نے اس کے سامنے وہ تصویر پیش

کی۔ جب سات برس کی عمر میں پائیں باغ کی روش پر ایک خوبصورت گڑیا بغل میں لئے یہ اور احسان دونوں کھیل رہے تھے۔ احسان نے گڑیا کو تھپڑ مارا کہ یہ پڑھتی نہیں۔ اور فاطمہ بگڑ گئی کہ دن بھر تو پڑھتی ہے اور کیا کتاب کا کیڑا بن جائے۔ دونوں کے کان میں ماں باپ کی سنی سنائی باتیں پڑی تھیں۔ خوب لڑائی ہوئی۔ جب شام ہونے لگی تو احسان نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "چلو جانے دو غصہ ہو چکا"

اس واقعہ کی یاد نے فاطمہ کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ اس کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے دل نے صدا دی "اب احسان کہاں اور میں کہاں؟ وہ امیر کا بچہ، میں بن باپ کی لڑکی" مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ احسان حیوان نہیں انسان اور بچہ نہیں جوان ہے۔ بچپن کی محبت اور نکاح آخر وقعت رکھتے ہیں۔ میرا باپ مر گیا۔ میری حالت بدل گئی۔ میں فقیر ضرور ہوں مگر قابل رحم۔ چچا جان، چچی اماں دونوں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیں۔ مگر احسان مجھ پر ظلم نہ کرے گا۔ میں احسان کی اور احسان میرا ہو چکا۔"

ایک بڑھیا عورت جوتیوں کو سٹر سٹر کرتی، میلا پھٹا برقع اوڑھے یہ کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی "اری زلیخا حق کا راضی اللہ ہے، دیر ہے اندھیر نہیں غریب کا صبر اکارت نہیں جاتا۔"

فاطمہ کی تیوری پر بل آ رہے تھے اور وہ چاہتی تھی کہ یہاں سے اٹھ اندر چلی جاؤں کہ بڑھیا نے کہا: "ڈاکٹر حکیم سب جواب دے چکے ہیں اور غریب کا کلیجہ توڑیں نتیجہ دیکھ لیا"۔ اب فاطمہ ذرا ٹھٹکی اور اس امید پر بڑھیا کا منہ دیکھا کہ یہ جلد کہہ دے کہ کس کے ہاں کیا ہوا؟

زلیخا "بیوی ہمارا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ وہی وارث ہے۔ جیسا میرے ساتھ کیا ہے وہی دیکھ رہا ہے۔ کریما بوا اللہ چاہے تو دیکھ لیجیو۔ ایسی مچ مچاتی لاش نکلے کہ پڑوسی تک کلیجہ مسوس کر رہ جائیں"

کریما "آن پڑی اور ایسی پڑی کہ ہوش اڑ گئے۔ وہ جوانا مرگ احسان کوئی دم کا مہمان ہے"

زلیخا، "خدا کی لاٹھی بے آواز تھوڑی ہے"

ادھر کریماؑ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، اُدھر موذن نے مغرب کی اذان دے کر افطار روزہ کا اعلان کیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا۔ دن بھر کی بھوکی پیاسی فاطمہ نے احسان کی خبر علالت سے روزہ کھولا۔ عقل چکرا گئی۔ ہر چند ضبط کی کوشش کی۔ مگر چہرہ پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ گم سم کھڑی کریمہؑ کا منہ تک رہی تھی کہ شاید آگے کچھ اور کہے۔ دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا اور کان کریماؑ کی آواز پر تھے۔ مگر خاموشی نے بالکل مایوس کر دیا۔ تو دو قدم آگے بڑھی۔ امتحان تھا بد نصیب سیدانی کا، جذبات نسوانی کا۔ مقابلہ تھا جہالت اور شرافت کا، غیرت اور محبت کا۔ روزہ اور نماز دونوں بھول گئی۔ ایک پتھر تھا کہ بے حس، ایک تصویر تھی کہ ساکت، ایک لڑکی تھی کہ مجبور، ایک مسلمان منکوحہ تھی، ایک خاموش جانور تھا۔ ایک بے جان مردہ تھا۔ بات دل سے نکل کر زبان پر آتی تھی۔ مگر زبان اُٹھتی نہ تھی۔ مشکل سے دو ایک لمحہ سکوت رہا ہوگا۔ لیکن فاطمہ کو یہ دو لمحے دو صدیاں تھیں، ڈرتی تھی۔ شرماتی تھی۔ مگر ایک چیز تھی جوان سب پر غالب آئی اور کہلوا دیا "کیا ہوا؟ کریماؑ کون بیمار ہے؟"

کریماؑ:۔ "بیمار کیا، بیٹی تیرا صبر پڑا ہے"

فاطمہ:۔ "چچا جان بیمار ہیں؟"

کریماؑ:۔ "نہیں وہ تو ہٹے کٹے بیٹھے ہیں، اللہ چاہے اپنے ہاتھ سے جنازہ ڈھوئیں کسی کا دل دُکھانا اچھا نہیں"

فاطمہ:۔ "چچی جان بیمار ہیں"

کریماؑ:۔ "نہیں جی، احسان کی کھٹیا کٹ رہی ہے۔ میں تو جانوں ہو بھی چکا ہوگا"

کریماؑ اس کے بعد خاموش تھی۔ مگر اس کی اس رائے نے کہ "احسان ہو بھی چکا ہوگا" فاطمہ کا خاتمہ کر دیا۔ کنوارا ناطہ، جوان لڑکی، سر پر ماں، سامنے کریماؑ۔ ہونٹ چپک گئے۔ لیکن دل کا اللہ مالک تھا۔ بس نہ تھا کہ کریماؑ کی زبان باہر نکال احسان کی مفصل کیفیت سن لے۔ جانتی تھی کہ یقین تو درکنار ظالم ماں کو اگر شبہ بھی ہو گیا کہ اس کو خیال ہے

تو کچا کھا جائے گی ۔ مگر بچپن کی محبت کچا دھاگہ نہیں ۔ کچھ وزن رکھتی تھی ۔ بے اختیار ہو گئی اور اس بے اختیاری میں کچھ ہوش نہ تھا ۔ یہ سوال کر بیٹھی ۔ "بیماری کیا ہے ؟"

زلیخا :۔ "میرا صبر ہے ! اور کیا بیماری ہو گی ؟ تو پوچھنے والی کون ہے ۔ تیرا کلیجہ کیوں پھڑ پھڑایا ؟"

فاطمہ :۔ "میں نے تو یونہیں ایک بات پوچھ لی ۔ مجھے کیا واسطہ کوئی مرے یا جئے ۔"

کریماً ۔ "جیتا تو ہو چکا کس کو اپنی جان اجیرن ہے جو گردن کا تولہ بھر خون دے گا ۔"

زلیخا :۔ "کیا ۔ گردن کا خون ؟"

کریماً :۔ "ڈاکٹر کہتا ہے کہ تولہ بھر خون آدمی کا اور وہ بھی گردن کا ہو جسم میں داخل کیا جائے تو بچ سکتا ہے ۔ لیکن تولہ بھر خون گردن کا نکلنے کے بعد آدمی کی اپنی زندگی کا یقین نہیں ۔"

زلیخا :۔ "اماں باوا کیوں نہیں دے دیتے ؟"

کریماً :۔ "پچیس پچیس ہزار روپیہ تولگا چکے کوئی نہیں دیتا ۔"

زلیخا :۔ "تو قبر کی ماں کیوں نہیں دے دیتی ؟"

کریماً :۔ "ڈاکٹر راضی نہیں ہوتا ۔ کمزور بہت ہے فوراً مر جائے گی ۔"

زلیخا :۔ "باپ تو سنڈ مسنڈ ہے ۔ وہ دے دے ۔"

کریماً :۔ "اب تو سب ہی نے انکار کر دیا ۔ زلیخا چلتی ہے تو چل تعویذ دلوا دوں ۔ اللہ چاہے دونوں بھائی قدموں میں ٹوپی رکھیں"

زلیخا :۔ "چلنے کو تو موجود ہوں ۔ مگر اس سیانی بچی کا کیا کروں ۔"

کریماً :۔ "اب دس بج رہے ہیں ۔ اندر سے کنڈی لگالے گی ۔"

زلیخا :۔ "ابھی تو سڑک چل رہی ہے ۔ ذرا اور سناٹا ہو جائے ۔"

(۳)

رات کا پچھلا پہر ہے۔ دن بھر کی تھکی ہاری مخلوق بستر استراحت پر بے خبر پڑی نیند کے مزے لے رہی ہے۔ غریب مسلمان البتہ اس وقت سحری کھانے میں مصروف ہیں۔

حسین منزل میں احسان بیہوش نہیں خاموش ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہے، اس کے ارد گرد تین عورتیں چپ چاپ بیٹھی، اس کی صورت دیکھ رہی ہیں۔ ماما، لونڈیاں، نوکر چاکر علیحدہ کمرے میں باری باری پہرہ دے رہے ہیں۔ دفعتہً احسان نے آنکھ کھولی اور کہا،۔

"میں ڈاکٹر کی رائے سے بے خبر نہیں ہوں۔ جسم سے پکے تین پاؤ خون کا نکل جانا یقیناً موت کا پیغام ہے۔ میرا ہاتھ اُٹھ نہیں سکتا۔ میرا پاؤں حرکت کرنے سے معذور ہے۔ زبان کام نہیں دیتی۔...... کوئی دم کا مہمان ہوں۔ پھوڑا میری جان لینے کو نکلا تھا...... اس وقت صرف ایک خواہش ہے" اس کے بعد احسان خاموش ہوگیا۔ مگر اب زبان کی بجائے آنکھوں نے کچھ کام کیا اور دونوں کویوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

توقیر بچہ کی یہ کیفیت دیکھ بیتابانہ اس کے گلے سے لپٹ گئی اور کہا،۔

"قربان گئی میں ماں اس چاند سی صورت پر۔ ہر چند ڈاکٹر سے کہا کہ میرا خون لے، مگر وہ رضامند نہ ہوا۔ احسان گھبراؤ نہیں، اللہ مددگار ہے۔ تم اپنی خواہش بیان تو کرو ابھی پوری ہوگی۔"

احسان:۔ "آہ...... کچھ نہیں"

توقیر:۔ "اے میرے لال کچھ تو کہو؟"

احسان:۔ "بس خون کی آپ کو ضرورت تھی وہ میز پر پیالی میں رکھا ہوا ہے"

توقیر:۔ "احسان میاں کیا بک رہے ہو؟"

بلقیس جو کمرہ میں ایک آرام کرسی پر لیٹی تھی۔ دیورانی کا یہ جواب سن کر بولی:۔

"نہیں بھابی جان، بک نہیں رہے۔ جب آپ ادھر تھیں، اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی۔ پیالی کی آواز سے میں جاگی اور میں نے جانے والے کی جھپکی بھی دیکھی۔ آیئے میز پر دیکھیں معاملہ کیا ہے؟"

تو فیر میز پر جھپٹی تو واقعی پیالی میں خون، گھلا ہوا تھا۔ اچھل پڑی۔ اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے آکر دیکھا اور کہا "واقعی آدمی کا خون ہے، مبارک، بچہ بچ گیا۔"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر نے عمل شروع کیا۔ اور جو صبح ڈاکٹر کی طرف سے موت کے واسطے مقرر تھی۔ اس نے احسان کی افاقہ کی صورت دکھائی۔ حالت روز بروز سنبھلتی گئی۔ اور ہفتہ ہی بھر میں وہ اپنے پاؤں سے چلنے پھرنے لگا۔

(۴)

وسیم دلہن ہشیار ہوئی تو بدن میں رعشہ تھا۔ دیوانوں کی طرح اٹھی اور نسترن سے پوچھا "کیا سچ مچ اسلام کا تار آیا ہے۔"

عارف اور نسترن دونوں خاموش تھے کہ بدنصیب ماں نے اپنے کلیجہ پر گھونسہ مارا اور چیخ کر کہا:۔ "ہائے اسلام رخصت ہوا۔"

سامنے دیکھا تو سلیم کی آنکھیں پھر چکی تھیں۔ روتی پیٹتی ادھر گئی تو بچہ کے منہ سے کف جاری تھے۔ اپنی اذیت نے جان پر بنا رکھی تھی۔ بدن ٹھنا جا رہا تھا۔ مگر ماتا کے مقابلہ میں اپنی تکلیف بھول چکی تھی۔ سلیم کے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگائے۔ اس کے منہ پر منہ رکھا۔ تو اس نے آنکھ کھولی اور ماں سے کہا:۔ "اماں جان مجھ بے گناہ کو زہر دے دیا۔ اچھا تمھاری خوشی۔ خدا کا واسطہ میرا کہا سنا معاف کرنا۔"

اتنا کہہ کر سلیم نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اماجان اب روؤ نہیں، مجھ کو تکلیف ہوتی ہے۔ جس ہمت سے زہر دیا، اسی صبر سے اب مجھ کو اپنے گھر سے رخصت کر دو۔ جاؤ اور اللہ تم کو نصیب کرے۔"

سلیم کی گفتگو اس قدر درد انگیز تھی کہ سننے والوں کے کلیجے پھٹ رہے تھے۔

وسیم دلہن بچہ کو لئے ڈاڑھیں مار رہی تھی۔ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی تھی۔ اس کا خون اپنے منہ سے ملتی تھی۔ اس کا سر کلیجہ سے لگاتی تھی اور ایک ایک کی صورت حسرت سے دیکھتی تھی اور کہتی تھی "خدارا مجھ دکھیاری پر رحم کرو۔ ارے میرے سلیم کو بچاؤ"

دفعتہً سلیم نے ہائے کہی اور یہ کہہ کر "ہائے میرا کلیجہ کٹا" ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ماں کی دعا خالی نہیں جاتی۔ واسطہ خدا کا دعا کیجئے میری مشکل آسان ہو"

وسیم دلہن نے یہ سن کر غور سے بچہ کی صورت دیکھی اور کہا "ہاں چندا سچ کہتا ہے زہر دینے والی بھی ماں تھی۔ موت کی دعا مانگنے والی بھی ماں ہو۔ سلیم اتنا ستم نہ کر میں ماں ہوں وہ ناشاد و نامراد ماں جس کے نام سے دنیا پناہ مانگے گی۔ ہائیں جب تک ان کے سر پر میرے ظلم کی شناخت دینے والا آسمان موجود ہے مجھ پر لعنت برسائیں گی۔ بچے جس وقت تک انکے قدموں میں میرے ستم کی گواہی دینے والی زمین زندہ ہے، مجھ پر ملامت کریں گے"

اب وفا شعار ماں نے نسترن کی طرف دیکھا اور کہا "وہ بیوی جس کے خیال سے زمین تھرائے گی۔ میں۔ وہ ماں جس کے نام سے آسمان کانپے گا۔ میں وہ ماں جس کی بدولت ایک جوان شیر کالے پانی میں عزیزوں کی صورت کو ترستا پھڑکتا دنیا سے رخصت ہو۔ میں وہ ماں جس نے اپنے ہاتھ سے کلیجہ کے ٹکڑے کو زہر دیا۔ میں۔۔۔۔۔۔۔

ہے کوئی خدا کا بندہ جو اس وقت میری مدد کرے؟ مدد اس کی جس نے کبھی دنیا میں کسی کو مدد نہ دی، رحم اس پر جس نے زندگی میں کسی پر رحم نہ کیا۔۔۔۔۔۔"

وسیم دلہن بلبلا رہی تھی کہ سلیم نے ہاتھ پاؤں پٹکنے شروع کئے اور آثارِ موت خود بخود نمودار ہوئے۔ اس نے ایک آخری تے اور کی اور اتنا کہہ کر بے ہوش ہو گیا۔

"اچھا اماں جان! خدا حافظ"

یہ فقرہ وسیم دلہن کے ضبط سے بڑھا ہوا تھا۔ اس نشتر نے ایسا شگاف دیا کہ

ہوش اڑ گئے۔ اٹھی۔ کھڑی ہوئی۔ جھجکی۔ ڈری۔ پیچھے ہٹی، اور کہنے لگی:۔

"کیسی مبارک روحیں نازل ہو رہی ہیں۔ نسیمہ جیسی دادی اور وسیم جیسا باپ سلیم کے استقبال کو آئے۔ ہائے ہائے اسلام کی روح بھی ساتھ ہے۔ دیکھو میری بہنوں سنو وہی دن ہے، وہی رات۔ وہی میں ہوں وہی گھر، مگر ایک چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا۔ اسلام کی موت سن چکی۔ سلیم کی موت دیکھ رہی ہوں۔ جسم پھٹ رہا ہے۔ ٹیسوں نے دم پر بنادی۔ لیکن کس گناہ کی پاداش میں؟ .... ایک ہو تو کہوں۔ ہر فعل گناہ، ہر لمحہ بوجھ۔ ہر سانس قصور۔ حقوق اللہ، حقوق العباد دونوں، اے ظالم دنیا۔ انسانیت، ایمان دونوں چیزیں غارت کیں؟" اتنا کہہ کر وسیم دلہن خاموش ہوئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگی:۔ "کیا کروں؟"

اب اس کا وہ جسم جو آگ میں کھول رہا تھا، تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ دو تین چیخیں ماریں۔ گھگی بیٹھ گئی۔ آنکھیں بند کرتی تھی اور کھولتی تھی۔ یہ کیفیت چار پانچ لمحے طاری رہی۔ اس کے بعد اس نے کہا:۔

"یہ میرا ایمان ہے۔ اے مقدس روحو! مجھ پر رحم کرو۔ ان ڈراؤنی صورتوں کو میرے سامنے سے ہٹا دو۔ مجھے اقرار ہے کہ گنہگار ہوں۔ اماں جان رحم کا وقت ہے۔ اسلام کی موت میرا کلیجہ توڑ گئی۔ یہ سلیم بن باپ کا بچہ ہے، مظلوم ہے جو جھ ماں کے ہاتھوں ذبح ہو رہا ہے۔ ارے خدا کا واسطہ! کیا ستم ہے۔ دیکھو کس بیدردی سے یہ خطرناک صورتیں دہکتے ہوئے گرز میرے سلیم کے پیٹ میں گھسیڑ رہی ہیں۔ ارے یہ بے گناہ ہے، ہائے ہائے اس کے جسم سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ دیکھو کیسی تیز چھری ہے۔ اے اللہ کے بندو! میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر میرے بچہ کو قتل کرو۔"

اب وسیم دلہن کی زبان بند تھی۔ مگر آنکھیں کھلی ہوئی۔ اس نے ایک جھرجھری لی، اور سنبھل کر بچہ کی طرف دیکھا۔ اٹھ بیٹھی اور گھسٹتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ دور سے اس

کا چہرہ دیکھا۔ غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ شوہر کی طرف دیکھا اور یہ کہکر چیخ ماری

"میرا مہمان رخصت ہوا"

عارف اور نسترن کیا جتنے آدمی موجود تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو اللہ اللہ نہ کر رہا ہو۔ ماں بچہ سے لپٹی ہوئی یا دونوں مُردے چمٹے ہوئے پڑے تھے اور دیکھنے والوں کی آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔

(۵)

جس گھر میں ایک رات ایسی بھی آچکی تھی کہ ہر متنفس ایک جوان شبیر کی موت کا یقین کر رہا تھا۔ ماں بچہ کی صورت دیکھ دیکھ کر مر رہی تھی اور کیفیت سن سن کر کلیجہ پر گھونسے مار رہی تھی۔ باپ دیوانوں کی طرح ایک ایک کا منہ تکتا اور چاروں طرف مارا مارا پھر رہا تھا۔ آج وہاں غسل صحت کی شادی ہے۔ اکلوتا بچہ، روپیہ کی کثرت، از سر نو زندگی کی خوشی، چپہ چپہ اور کونہ کونہ سے برس رہی تھی۔ عالی شان مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے ناچ رنگ کھیل تماشے۔ تین دن اور تین رات۔ دن عید اور رات شبرات تھی۔ حسین اور نو قسیمہ دونوں میاں بیوی بچہ کی صحتیابی پر اشرفیاں لٹا رہے تھے۔ تیسرے روز شام کے وقت جب شادی ختم ہوئی تو احسان اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا تھا کہ بلقیس اس کے پاس گئی اور کہا۔

"احسان میاں خدا نے فضل کیا یہ چاند سی صورت دوبارہ دکھائی ورنہ ڈاکٹر اور حکیم تو جواب دے ہی چکے تھے"

احسان:۔ "جی ہاں۔ چچی جان خدا نے بڑا فضل کیا"

بلقیس:۔ "تم نے اس محسنہ کا بھی شکریہ ادا کیا۔"

احسان:۔ "پہلے تو میں آپ سے متفق تھا اور میرا خیال بھی یہی تھا وہ فاطمہ تھی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ دونوں ماں بیٹیاں اس خوشی میں شریک تک نہ ہوئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی ہماری نمک حلال ماما تھی۔ تعجب نہیں کہ ظہورا ہو۔ جو دوسرے ہی روز مری ہے"

بلقیس ۔ " لیکن تم نے تو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ فاطمہ تھی ۔ میں نے بعد میں کہا ہے ۔"

احسان ۔ " یہ میرا خیال ہے ۔"

بلقیس ۔ " مگر آنکھیں تو غلط نہ تھیں ؟ "

احسان ۔ " ممکن ہے نظر کو دھوکا ہوا ہو ؟ "

بلقیس ۔ " تمھاری اور میری دونوں کی ؟ "

احسان ۔ " کیا آپ کو یقین کامل ہے ؟ "

بلقیس ۔ " حق الیقین ۔ عین الیقین ۔"

احسان :۔ " تو میں ابھی کھانے کا حصہ بھجواتا ہوں ۔"

اتنا سن کر بلقیس کے تمام جسم میں سناٹا سا آ گیا اور اس نے سوچا کہ اس سے زیادہ نامعقول انسان اور شوہر کیا ہو سکتا ہے ، جو ایک جان کی قربانی کا معاوضہ دو روٹیاں کافی سمجھتا ہے ۔ بھتیجے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ اس کا منہ دیکھا اور فوراً باہر نکل آئی ۔

(۶)

زلیخا ۔ " ہائے کریما کیا کروں ، خدا بھی بھرے ہی کو بھرتا ہے جس کمبخت کو دنیا جواب دے چکی تھی وہ تو لوٹ پیٹ کر اچھا ہو گیا اور میری بچی آس نیاس اسی روز سے سست پڑ گئی ۔"

کریما :۔ " میں تو جانوں ڈاکٹر کو دکھاؤ ۔"

زلیخا :۔ " دکھاؤں کیا خاک ! اوّل تو وہ راضی ہی نہیں ہوتی اور اگر لے بھی جاؤں تو کس برتے پر ؟ دھرا ہی کیا ہے ؟ "

کریما :۔ " میں تو جانوں یہ چیچک ہے ، دیکھو جسم میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ؟ "

زلیخا :۔ " ہاں چیچک ہے ، آج سات روز ہو گئے ۔ اڑکر دانہ تک منہ میں نہیں گیا ۔"

کریما :- " کھا ہی کیا سکتی ہے دودھ کے سوا کچھ حلق سے اترہی نہیں سکتا۔ میرے برابر جو ڈاکٹر رہتا ہے میں اس سے کہہ تو آئی ہوں۔ بہت رحمدل آدمی ہے۔ غریبوں کا علاج مفت کرتا ہے کہتا تھا دس بجے آؤں گا۔ اب آتا ہی ہوگا "

زلیخا :- " بوا تو جیتی رہے میرے پاس گھس لگانے کو آدمی نہیں کہ کہیں بھیجوں، پیسہ نہیں کہ علاج معالجہ کراؤں "

ابھی کریما جواب نہ دینے پائی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی۔ پردہ ہوا۔ اندر آئے فاطمہ کو دیکھا اور کہا :-

" یہ چیچک نہیں فساد خون ہے۔ گردن میں جو لوہا یا چاقو لگا ہے اس کی وجہ سے یہ زخم ہوا۔ اس میں کوئی ایسا مادہ تھا جو خون میں سرایت کر گیا اور اسی کی خرابی ہے "

زلیخا :- (کریما سے) " تو بھی اچھے بیوقوف کو لائی۔ کیسا زخم۔ کس کا لوہا۔ سینلا کو فساد خون بتا رہا ہے "

ڈاکٹر چلا گیا۔ تو زلیخا بچی کے پاس آئی اور کہا۔ فاطمہ کیسا زخم کہہ رہا تھا دیکھوں "

فاطمہ :- " جی کوئی زخم وخم نہیں۔ بھلا لوہا کیسا اور چاقو کیسا۔ خدا معلوم کیا سمجھا "

زلیخا :- " میں تو پہلے ہی کہہ رہی ہوں "

فاطمہ :- " آپ ہی آرام ہو جائے گا "

(۷)

وسیم دلہن جیسی جفاکار عورت کی موت کو بہ ظاہر اس کے سوا کوئی انتظار نہ تھا کہ وہ اپنے اعمال کی سزا پوری طرح بھگتے۔ تڑپ تڑپ کر مرے اور پھڑک پھڑک کر دنیا سے رخصت ہو۔ ضرورت تھی اور اشد کہ سنگ دل کی موت دیکھنے والوں کو نصیحت اور سننے والوں کو عبرت ہوتی۔ مگر تعجب ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اعمال کا پلڑا اس بوجھ سے زمین میں گھسا جاتا تھا۔ مگر دوسرا جہاں نیکی کے شائبہ تک سے خالی تھا محض ایک عمل سے جو زندگی کے سیاہ آسمان اور تیرہ و تار مطلع پر ستارہ

کی طرح چمک رہا تھا۔ موت وحیات کی کش مکش میں برابر کا شریک اور مصائب و آلام کے حملوں میں اپنی بساط کے موافق سپر کا کام کر رہا تھا۔ وسیم دلہن کے شناسا اس رات سے واقف ہوں گے۔ جب وسیم اس کا پہلا شوہر مرض الموت میں گرفتار تھا۔ قیامت خیز رات کی تاریکی نسیمہ کے گھر پر چھا چکی تھی۔ موت کے آثار مریض کے چہرے پر ظاہر اور مکان کے در و دیوار پر نمایاں ہو چکے تھے۔ ماحتا کی ماری ماں دیواروں سے سر پھوڑ رہی تھی اور مضطرب باپ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ڈاکٹری دوا میز پر رکھی تھی اور آخری خوراک کا وقت رات کے چار بج کر بیس منٹ پر تھا۔ نسیمہ اور قسیم دونوں ماں باپ نیند کی جھپیٹ میں آگئے۔ مگر وسیم دلہن نے صرف یہ سوچ کر کہ دوا کا وقت ٹل نہ جائے۔ اٹھ کر منہ دھویا۔ نیند کو ٹالا اور اپنا آرام شوہر کی صحت پر قربان کر آہستہ آہستہ اس کے پاؤں سہلانے لگی۔ یہاں تک کہ دوا کا وقت آیا اور بیوی نے بسم اللہ کہہ کر شوہر کو دوا پلائی۔

قیاس تو کہتا ہے کہ بیوی کا یہ فعل کچھ زیادہ توجہ کا مستحق نہیں۔ مگر قدرت کے راز انسان کی سمجھ سے ظاہر ہیں۔ بیوی کا یہ فعل خدا کی درگاہ میں پسند آیا۔ گو اس تمام کوشش میں ازسرتاپا نفسانیت ہی نفسانیت تھی اور خدا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن اپنی ضرورت یا اپنی محبت اپنی غرض صرف اس لئے کہ ادائیگی فرض کی ایک جھلک اس میں موجود تھی عمل صالح سے تعبیر ہوئی۔ جو اعمال نامہ ابتدا سے انتہا تک گناہوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ دامن پر یہ سفیدی کا نشان بھی موجود ہو گیا۔ خوفناک فرشتے جن کی صورت دیکھ کر دل دہلتا تھا منہ پھاڑے کھڑے تھے مگر جس طرف حملہ کرتے تھے۔ اسی طرف یہ چھوٹی سی زنجیر پاؤں میں اٹکتی تھی۔ ادھر یہ کچھ گذر رہی تھی اور ادھر رات خراماں خراماں منزل مقصود کی طرف جا رہی تھی۔ خبر نہ تھی کہ رات کس قدر گزری کہ طائرانِ خوش الحان کے نغمہ نے خاتمہ شب کا نقارہ بجایا۔

پو پھٹنے لگی۔ چاند مدھم ہوا۔ چاندنی پھیکی پڑی اور صبح صادق نے رات کا گریبان چاک

کر اپنے رُخِ روشن کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔ رات دن کا گلے مل مل کر جدا ہونا بجائے خود ایک مؤثر سماں تھا کہ طائرِ خوش الحان پھر چہچہایا۔ اس آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ بیہوش وسیم دلہن نے آنکھ کھول دی۔ نگاہ اوپر اٹھی تو پیپل کے سرسبز پتوں پر بیٹھا ہے ثانی کے گیت گا رہا تھا طائر کی صدا کلیجہ کے پار ہو رہی تھی۔ وسیم دلہن اس میں ایسی محو تھی کہ وہ اس وقت اپنی اذیت اور بچوں کی مصیبت سب بھول گئی۔ صرف خدا کی قدرت اور اپنی حالت اس کے سامنے تھی کہ نمازِ فجر کے غلغلہ نے حواس باختہ کر دیئے اور خدائے برحق کی زبردست طاقت کے ساتھ ہی اپنے اعمال ایک ایک کر کے اس کے روبرو آئے

وہ دیکھ رہی تھی کہ بے وارثا فاروق اپنی کٹی ہوئی انگلیاں سامنے لئے کھڑا کہہ رہا ہے کہ "آپ نے اپنے بچے کے واسطے چھری اس طرح کھینچی کہ میری انگلیاں لہولہان ہوگئیں۔ چھوٹی اماں تھوڑا سا پانی ڈال دیجئے"

اس کو دکھائی دے رہا تھا کہ بن ماں باپ کا بچّہ حفیظ اپنے جسم کی ہڈیاں دکھا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے "خالہ جان مجھ بے گناہ کو آپ نے لوتھ کر دیا۔ لِلّٰہ مجھے کپڑا اُڑھا دیجئے۔ بخار چڑھ رہا ہے"

اس کی آنکھ کے سامنے تھا کہ عارف بھوکا پیاسا کچہری جا رہا ہے اور وہ خاموش بیٹھی دیکھ رہی ہے اور خیال نہیں کرتی کہ شوہر کی یہ تکلیف کیا معنی رکھتی ہے۔ اعمالِ گذشتہ کی پوری تاریخ پیش نظر تھی اور جس عمل پر نظر ڈالتی تھی ایک سے ایک سخت اور زہریلا ! کہیں یتیم اس کے مظالم کی رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ کہیں رانڈیں اس کے ستم پر واویلا مچا رہی تھیں۔ یہ عمر بھر میں پہلا اتفاق تھا کہ وسیم دلہن نے اپنی زندگی پر لعنت بھیجی اور اس کو معلوم ہوا کہ دنیا کے ساتھ دین بھی برباد گیا۔ یہ خیال آتے ہی تمام بدن تھرتھرا گیا اور جب یہ یقین ہوا کہ موت سر پر آ پہونچی اور اب دم بھر کا چھٹکارا نہیں۔ تمام اعضاء بے سکت پڑے تھے تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کھلی ہوئی آنکھ بند کر کے گردن کو جنبش دی۔ یہ

ندامت کا سجدہ تھا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ جو وسیم دلہن کی زندگی پر لعنت بھیج رہا تھا اس کا حشر دیکھنے آگے بڑھا۔ اطاعت وسیم کا وہ عمل جو اعمال نامے میں علیحدہ چمک رہا تھا۔ بدنصیب کی سفارش کو سامنے آیا اور درگاہ رب العزت میں رحم کی درخواست کی۔ مگر وسیم دلہن کے مظالم ایسے ہلکے نہ تھے کہ بآسانی معاف ہو جاتے۔ فیصلہ حقیقی آیندہ کے واسطے ملتوی ہوا۔

(۸)

صبح کی نماز سے فراغت پانے کے بعد بلقیس نے تھوڑی دیر کلام اللہ کی تلاوت کی، پڑھ چکی تو عبادت خانے سے نکل کر اندر کے کمرے میں چائے پی رہی تھی کہ احسان سامنے آیا اور کہا:۔ "لیجئے چچی جان پردہ کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب آگئے۔ اگر آپ ڈاڑھ نکلوانی نہیں چاہتیں۔ تو دکھا تو دیجئے۔"

پردہ ہوا۔ ڈاکٹر نے درد کی دوا دی۔ احسان اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا کہ ڈاکٹر نے کہا:۔ "آپ کی چچی کی لڑکی کی حالت اچھی نہیں۔ اس کا تمام چہرہ بگڑ گیا۔ اس کی گردن میں کوئی زخم لگا ہے اور کسی ایسے لوہے سے جس میں خراب مادہ تھا۔"

احسان:۔ "جی ہاں، میں نے بھی سنا ہے۔"

بلقیس:۔ "آپ نے علاج شروع کیا۔"

ڈاکٹر:۔ "نہیں میں گیا تو اسی واسطے تھا، مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ فیس کے قابل نہیں وہ بچی میرے سامنے پیدا ہوئی۔ میں نے اس کے باپ سے ہزاروں روپیہ لیا۔ چلا گیا۔ لیکن وہاں جا کر میں یہ سمجھ گیا کہ اس زخم میں کوئی راز ہے جس کو وہ چھپانا چاہتی ہے اور میں اس کے استقلال اور ہمت کی تعریف کرتا ہوں کہ سخت تکلیف میں بھی اس کی تیوری پر بل نہیں بلکہ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش ہے"

بلقیس:۔ "جی ہاں سنا تو میں نے بھی ہے مگر مفصل کیفیت معلوم نہیں۔"

احسان :- "سنتا ہوں کہ اس کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔"

ڈاکٹر :- "قطعی۔"

احسان :- "اگر وہ زندہ رہی تو شاید صورت درست نہ ہو سکے۔"

ڈاکٹر :- "بہت مشکل ہے۔"

احسان :- "افسوس!"

ڈاکٹر چلا گیا تو بلقیس چند لمحہ خاموش رہی۔ وہ خاموش ہی تھی کہ احسان بھی چلنے لگا۔ بلقیس نے اشارہ سے اس کو روکا اور پاس بلا کر کہا :-

"تم نے سنا ڈاکٹر نے کیا کہا؟ کیا فاطمہ جیسی بے مثل بچی کے بے نظیر احسان کا بدلہ تمھارے پاس کچھ نہیں؟ کیا اس کی قربانی تمھاری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی؟"

احسان :- "کیوں نہیں۔ آپ جو فرمایئے؟"

بلقیس :- "میں کیا کہوں گی۔ تم خود سوچو؟"

احسان :- "میں علاج کے واسطے روپیہ دینے کو موجود ہوں۔"

بلقیس :- "میں اسے دیکھنے جاتی ہوں۔"

احسان :- "ہو آیئے۔"

بلقیس :- "تمھارا جی جانے کو نہیں چاہتا؟"

احسان :- "آپ دیکھ رہی ہیں گرمی تیز ہے؟"

بلقیس :- "مگر میں بھی تو اسی گرمی میں جاؤں گی۔"

احسان :- "اس وقت آپ چلی جایئے۔ میں پھر ہو آؤں گا؟"

بلقیس :- "اچھا۔"

اتنا کہہ کر بلقیس کسی ایسے خیال میں ڈوبی کہ احسان آنکھ بچا چلتا ہوا اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ وہ دفعتہً چونکی تو اس کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے ماما سے کہا۔

"کوچوان سے کہو گاڑی تیار کرے۔" اتنا کہہ بلقیس نے معمولی لباس تبدیل کیا اور بھتیجی کے ہاں پہنچی۔ ایک جاہل اور ناعاقبت اندیش عورت کے ہاتھوں جو حشر اس کا اپنا اور متعلقین کا ہوا یا ہو سکتا ہے وہ زلیخا اور اس کے ساتھ فاطمہ کا ہو چکا اور ہو رہا تھا۔ اس غلطی کو محسوس کر کے بھی کمبخت زلیخا نے شوہر کی زندگی میں اپنی جوانی اور اس کے بڑھاپے کا کبھی لحاظ نہ کیا اور نہ سمجھا کہ بہت جلد بڈھے شوہر کی موت میرے تمام اعزاز و اکرام کا خاتمہ کر دے گی۔ اور اس کی موت نہ صرف ایک عزیز شوہر کو مجھ سے جدا کرے گی بلکہ بے وارث بنا کر دنیا بھر کی مصیبتوں کے پہاڑ میرے سر توڑ دے گی۔ زلیخا پر اور بھی الزام ایسے ہیں۔ جن کا معقول عذر ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ وہ انسان تھی اس کے منہ پر آنکھیں تھیں اس کے دماغ میں بھیجا تھا۔ دیکھنے سے قاصر اور سمجھنے سے معذور نہ تھی۔ جان سکتی تھی کہ شوہر کے بعد دونوں دیور لاریب دبلاشبہ ایسی حالت میں کہ کوئی تجارت، کوئی کوٹھی، کوئی مکان، کوئی دکان مشترکہ نہیں، بھائی کی بیوی سمجھ کر جو سلوک کر رہے ہیں انکا فرض نہیں، عنایت اور قرضہ نہیں۔ انسانیت ہے۔ مناسب تھا کہ احسان کا گن مانتی اور عنایت کا شکریہ ادا کرتی۔ مگر باوجودیکہ اچھی طرح سمجھتی اور پورے طور پر جانتی کہ خالی ہاتھ ہوں۔ اور کچا ساتھ ہے۔ بیٹھنے کو گز بھر کی ٹھگلی اور کھانے کو ٹکڑے تک کا سہارا نہیں۔ میکا اور سسرال فنا ہو چکی۔ لیکن بڑے اور چھوٹے دونوں دیوروں کی عنایت کو ہمیشہ اپنا حق سمجھا۔ وہ اکثر بے وقوف عورتوں کی طرح حقوق کے نشہ میں چکنا چور تھی اور اس کو یقین کامل تھا کہ ایک وارث مر کر دو وارث چھوڑ گیا اور دونوں کا فرض ہے کہ اپنی بیوی سے زیادہ میری اور بچوں سے بڑھ کر فاطمہ کی نازبرداری کریں۔ لیکن یہ ایسا لغو خیال تھا جس نے زلیخا کی یہ کچھ مٹی پلید کی۔ مگر وہ نشہ پھر بھی نہ اترا۔ بلقیس پہنچی تو سہی، مگر ڈرتی ڈرتی۔ ڈر یہ تھا کہ جس نیک بخت نے حصہ ٹھکرا دیا تھا۔ اسے مجھے دھتکارتے کیا شرم آئے گی۔ لیکن فاطمہ کی شفقت یا محبت نہیں۔ اس کا ایثار یہ حق رکھتا کہ ایک

بلقیس کیا ہر مسلمان اس کی تکلیف میں شریک ہوتا۔ اور دل کھول کر اس معصوم بچی کے شریفانہ جذبہ کی داد دیتا۔

بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس اندیشہ سے کہ بعض انسان نما جانور عصمت کی اس دیوی پر کوارے ناطہ کی وجہ سے نفسانیت کا الزام نہ لگائیں! یہ ایسی بے دردی ایسی سنگ دلی اور اس قدر ستم ہوگا جس سے ذلیل فعل جس سے رکیک خیال جس سے مکروہ کام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ خطبۂ نکاح نے فاطمہ کو احسان کی بیوی بنا دیا۔ اور اس پر بیوی کے تمام حقوق فرض ہو گئے۔ اس کا یہ ایثار قبل از وداع اس کی شان کو اور بھی ارفع و اعلیٰ بنا رہا ہے اور لاریب فاطمہ کی ہستی اس لائق تھی کہ ارشاد نبویؐ پر ایمان لانے والے مسلمان آنکھیں بند کر کے اس کو مرحبا کہیں۔ بلقیس داخل ہوئی تو زلیخا نے ناک بھوں چڑھا کر اس کا استقبال کیا۔ تیوری کے بل سے سلام کا جواب دیا اور منہ پھیر کر کہنے لگی۔

"آج کیا جاتی دنیا دیکھی جو ادھر کا رخ کیا۔"

بلقیس:۔ "کچھ نہیں ذرا فاطمہ بیگم کی خیر صلاح کو آئی تھی، سنا تھا طبیعت علیل ہے۔"

زلیخا:۔ "اس سے اب آپ کا کیا واسطہ؟ جہاں جلیٹھ مرے وہاں بھتیجی بھی مرگئی اور تم سے کیا شکایت، جن سے ہزار برس کی نیو اور اندھیرے گھر کی روشنی ہے، انھوں نے ہی پرواہ نہ کی۔ خیر میرا نام بھی زلیخا ہے۔ وہ ناک چنے چبواؤں کہ عمر بھر یاد رکھیں

بلقیس:۔ "یہ تو آپ اور وہ جانیں۔ میں تو صرف بچی سے ملنے آئی ہوں۔"

زلیخا:۔ "ایسی باتیں میں بھی خوب سمجھتی ہوں۔ ان ہی کی بھیجی ہوئی آئی ہو اور تھوڑے روز صبر کیا ہوتا، تاکہ پوری ناک کٹ جاتی۔ اب کیوں دنیا کا لحاظ کیا۔"

سامنے کے درے میں فاطمہ خاموش پڑی یہ تمام باتیں سن رہی تھی۔ جب چچی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے آداب کیا اور ہاتھ جوڑ کر اشارے سے کہا خاموش رہیے اور یہاں آئیے۔ بلقیس اٹھ کر فاطمہ کے پاس گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ پھول سے رخسار مرجھا کر

سیاہ ہو گئے! سر سے پاؤں تک بڑے بڑے دَدوڑے سُرخ سُرخ پڑے ہوئے ہیں اور قریب قریب کوڑھ کی سی کیفیت ہے۔ خفیف بخار چڑھا ہوا ہے اور کثیف کپڑے جسم پر ہیں!

بلقیس بیتاب ہو گئی اور گو نہایت ہی نفیس مزاج عورت تھی۔ مگر جھکی اور اس کے منہ کو بوسہ دیا۔ فاطمہ نے ہر چند کوشش کی کہ اپنا منہ ہٹالے۔ مگر نہ ہٹا سکی۔ ناکام ہو کر اس کی آنکھ میں آنسو آگئے اور کہنے لگی :۔

"چچی جان کیا غضب کرتی ہیں۔ یہ منہ اب اس قابل نہیں۔ اس کو دیکھ کر کراہیت آتی ہے۔ آپ اپنے ہونٹھ دھو ڈالیے۔ ایسا نہ ہو چچی جان آپ کا جی متلانے لگے "

بلقیس :۔ "بیٹی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمھارے قدم ہمارے سر اور آنکھوں پر جگہ پانے کے قابل ہیں"

فاطمہ :۔ "توبہ توبہ! چچی جان ایسا نہ فرمایئے"

بلقیس :۔ "بیوی میں تمھاری ہمراز ہوں اور جس وقت تم نے وہ کام انجام دیا ہے جو ہمیشہ تم کو زندہ رکھے گا۔ میں جاگ رہی تھی"

فاطمہ :۔ "آپ کیا فرما رہی ہیں۔ کیسا کام؟"

بلقیس :۔ "پیاری بچی مجھے ساری کیفیت معلوم ہے۔ جس وقت تم نے خون کی پیالی میز پر رکھی ہے۔ اس وقت میں نے تم کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا"

فاطمہ :۔ "میں اس کے جواب میں کیا عرض کروں"

بلقیس :۔ "مگر کس قدر تعجب انگیز اور قابلِ افسوس بات ہے کہ دنیا نے تمھاری قدر نہ کی"

فاطمہ :۔ "........"

بلقیس :۔ "حق یہ ہے کہ تم پرستش کے قابل ہو"

فاطمہ :۔ "چچی جان! آپ مجھ کو کیوں شرمندہ کر رہی ہیں"

بلقیس :۔ "مجھے قلق اس امر کا ہے کہ احسان سے قدر کی توقع نہیں"

فاطمہ:۔ "میں نے جو کچھ کیا توقع پر نہیں۔ میرا فرض تھا۔ اس کی قدر کیا ہوتی"

بلقیس:۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ تمھاری آیندہ زندگی ناکام نہ ہو جائے"

فاطمہ:۔ "آپ اندیشہ نہ کیجئے۔ یہ ظاہر ہے چچی جان! میری صورت ہی اس قابل نہ رہی کہ میں کامیاب ہو سکوں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ وہ یا ان کے والدین میری طرف متوجہ ہوں"

بلقیس:۔ "والدین کو جانے دو۔ مجھے احسان سے امید نہیں"

فاطمہ:۔ "آپ کیا فرماتی ہیں۔ امید ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ فطرت انسانی ہے۔ وہ آخر انسان ہیں اور میرے پاس کوئی چیز ان کو متوجہ کرنے کی نہیں۔ جب کشش کا کوئی سامان نہ رہا تو مجھ کو ملال نہیں ہو سکتا"

بلقیس:۔ "تمھارا یہ فعل جس نے تمھاری یہ گت بنائی غیر معمولی قدر کے قابل ہے"

فاطمہ:۔ "فرض کے ادا کرنے پر قدر کی توقع یقیناً غلطی ہے۔ احسان میرا شوہر ہے۔ خدا کا دیا۔ پنچوں کا دیا۔ اس کو میرے بعد زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ مگر میری زندگی اس کے بعد بے سود تھی۔ یہ صحیح کہ اس کی موت کے صدمہ میں بیوی والدین کے ساتھ برابر کی شریک نہ ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ موت کا اثر جو بیوی پر ہوگا اور جو مٹی اس کی پلید ہوگی۔ جو بربادی اس کی ہے وہ کسی اور کی نہیں۔ چچی جان! میں نے ہرگز ہرگز احسان پر احسان نہیں کیا۔ میرا یہ کہنا بھی مبالغہ ہوگا اور ہے کہ فرض ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے میں نے اپنی آیندہ بہبودی کے واسطے کیا۔ میری نیت تو یہی تھی۔ اگر واقعات نے دوسری صورت اختیار کی تو اس کا ذمہ دار کوئی نہیں"

بلقیس:۔ "مجھے تعجب ہے کہ مسلمانوں میں ایسے خیال کی بچیاں موجود ہیں"

فاطمہ:۔ "للہ مجھے شرمندہ نہ کیجئے"

بلقیس:۔ "میری سمجھ میں تمھاری منطق نہ آئی۔ تم نے احسان کو اپنا شوہر سمجھ کر اپنی جان اس پر قربان کی۔ اب اگر وہ تم کو اپنی بیوی نہ سمجھے تو یقیناً تم کو تکلیف ہوگی"

فاطمہ:۔ "اس کے متعلق تو میں عرض کر چکی۔ شاید آپ نے غور نہیں فرمایا۔ عورت کے واسطے جس طرح صرف حسن صورت ہی شوہر کا دل فتح کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسی طرح حسن سیرت بھی۔ ضرورت یہ ہے کہ بیوی صورت اور سیرت دونوں صفتوں سے آراستہ ہو۔ میں اگر کھال کی جوتیاں بھی احسان کو پہنادوں تو بھی مجھے حق نہیں کہ میں اس سے کسی عنایت کی متوقع ہوں۔ چچی جان! آپ خود دیکھ رہی ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کس طرح میرے پاس اتنی دیر بیٹھ سکیں۔ میری صورت دیکھ کر گھن آتی ہے۔ میں ایسی اندھی تو نہیں ہوں کہ اس حالت میں یہ خواہش کروں کہ احسان میرے پاس بیٹھنا تو درکنار میری طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کو تکلیف ہوگی اور اس کو کیا ہر شخص کو مرد ہو یا عورت۔ بہن ہو یا بھائی میرے پاس بیٹھ کر، میری صورت دیکھ کر اذیت لازمی ہے۔ میں صرف ایک خواہش رکھتی ہوں۔ مگر مجھے اس پر اصرار کا حق نہیں کہ موت جس وقت میری زندگی ختم کرے۔ اس وقت میں احسان کے نکاح میں ہوں۔ اگر آپ کو وقت فرصت دے اور موقع ہو تو میری یہ التجا احسان تک پہنچا دیجئے گا۔ مگر میرا جو راز آپ کے پاس امانت ہے۔ اگر آپ نے کسی حالت میں بھی اس کا افشا کیا تو قیامت کے روز میں آپ سے مواخذہ کروں گی۔ اس پیام کے ساتھ ہی جو میں آپ کے ہاتھ احسان کو بھیج رہی ہوں۔ میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں کبھی یہ خواہش نہ کروں گی کہ احسان میری صورت دیکھے یا میری کسی ضرورت کا بار اس کے اوپر رہے۔ میں کروشیا اور کشیدہ کا کام اچھی طرح سیکھ رہی ہوں اور اس محنت کی آمدنی میری ضرورتوں کو کافی ہوگی۔ اگر میں زندہ رہی۔"

بلقیس:۔ "اگر تم کو ناگوار نہ ہو تو میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔"

فاطمہ:۔ "ضرور فرمایئے۔"

بلقیس:۔ "یہ کچھ روپیہ اپنے پاس رکھ لو۔ علاج معالجہ وغیرہ میں کام آئے گا۔"

فاطمہ:۔ "بہت اچھا، مگر دو سو روپیہ کی تو بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ سو روپیہ چھوڑ جائیے۔ مگر اس میں ایک شرط ہے"

بلقیس:۔ "وہ کیا؟"

فاطمہ:۔ "اگر میں تندرست ہو سکی، تو اس کے واپس کرنے کی کوشش کروں گی۔ ورنہ آپ معاف کر دیجئے گا"

(۹)

سلیم کا زہر کچھ ایسی سانپ کی چھچھوندر بنا تھا کہ نگلے بین نہ اُگلے اچھا ہوتا تھا۔ نہ موت آتی تھی۔ ڈاکٹر نے مجبور ہو کر احمد نگر بھیج دیا۔ مگر پندرہ ہی روز بعد اس کی خبر موت ماں کے کانوں میں آ گئی۔ لیکن وسیم دلہن اب وہ وسیم دلہن نہ تھی اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے اور وہ زندگی، جس کا نام ابدی ہے۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ جس پر آسمان اور زمین کی ہستی لعنت بھیج رہی تھی جس سے بدتر کوئی زندہ مخلوق دنیا میں نہ تھی۔ وہ موت کے منہ سے بچ کر اب صرف اس لئے زندہ ہوئی ہے کہ اعمال گذشتہ کی تلافی کرے اور دوسری عورتوں کے واسطے ایک نمونہ ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ وسیم دلہن کی یہ حالت صرف شیطانی اثر تھا ورنہ معقول باپ کی اولاد۔ اچھی ماں کی بیٹی۔ خاندان کی شریف اور ان سب پر طرہ نسیمہ جیسی ساس کی صحبت دو چار مہینے نہیں برسوں کی بھگتی ہوئی۔ آخرت کا خیال آتے ہی لرز گئی۔ صحت پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ لیکن اس لئے نہیں کہ بچ گئی، بلکہ اس واسطے کہ توبہ کر دوں اور سرخ رو جاؤں۔ کلام الٰہی یا حدیث رسولؐ کی حافظ تو نہ تھی، مگر پانچ سال ایسے گزرے تھے کہ دن رات گھر میں قرآن و حدیث کا چرچا تھا اور ساس کی زبان سے معمولی باتوں میں بھی مذہبی پھول جھڑتے تھے۔

اس وقت وسیم دلہن کی عمر چالیس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اور کہنے کو بڑھاپا سر پر

پہنچا تھا لیکن اس کا ایمان یہ تھا کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ گناہ پر توبہ کرنے والا ایسا ہے۔ گویا کوئی گناہ کیا ہی نہ تھا۔ ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اب اس کے وقت کا بیشتر حصہ، دن کی مسلسل گھڑیاں۔ رات کے متواتر گھنٹے اسی ادھیڑ بن میں بسر ہوتے کہ عمر گذشتہ کی تلافی کیا کروں، کیوں کر کروں اور کس طرح کروں کتابوں میں پڑھا تھا اور وسیم دلہن کے معاملہ میں دیکھا کہ نیکی کا ادنیٰ ذرہ قلب میں پیدا ہوتے ہی دماغ کی آبیاری سے کہیں کا کہیں پہونچا ہے۔ دن کیسے گھڑیوں لمحوں اور منٹوں بڑھا۔ تنے ہوئے سر اور اکڑی ہوئی گردن جھکنے کی دیر تھی۔ قدرت کے انعام ہر چہار طرف سے آموجود ہوئے۔ اب وہ جدھر نظر اٹھاتی اور جس طرف رخ کرتی کائنات کا ہر ذرہ خالق الموجودات کی لازوال طاقت کا پیام سناتا! کہتے ہیں غور و خوض کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد شوق محبت کی انتہائی حالت اور مجبوری و معذوری کی ایک خاص کیفیت میں داؤد علیہ السلام نے عرض کی کہ "بار الٰہا تیرے احسانات کا معاوضہ ادا اور تیرے اکرام کا بدلہ کس دل سے ادا کروں۔ کیوں کر کروں، کس طرح کروں۔ جسم کا ہر رونگٹا اور اس کا ہر بال اگر انسان بن کر اور زبان ہو کر تمام عمر تیری حمد کرے تو شکریہ محال اور معاوضہ ناممکن" جواب ملا "داؤد انسان یہ سمجھ لے کہ شکریہ سے قاصر ہے۔ شکریہ ہو گیا" وسیم دلہن بحالت موجودہ زبان سے کیا، اس کی پوری زندگی کا ہر سانس، سانس کی ہر کیفیت خدائے برتر کی عظیم الشان طاقت کا اقرار کر رہی تھی۔ صداقت اس کے چہرے سے، عجز اس کی آنکھوں سے پشیمانی اس کی صورت سے ظاہر، عیاں اور روشن تھی۔ جس نے آغوش مادر سے جدا ہو کر بیس اور بیس چالیس سال ایک لمحہ کے واسطے اپنی گردن درگاہ ایزدی میں جھکائی وہ اب ہر متنفس کے روبرو خم تھا۔ جو آنکھ اس تمام عرصہ میں کبھی بھول کر بھی دم بھر کو رحم کے آنسو سے آشنا نہ ہوئی۔ وہ آج خوف خدا سے ساون بھادوں کی جھڑیاں بہا رہی تھی۔ اور

وہ دسیم دلہن جس نے شوہر جیسی طاقت کو تیرہ سال ٹھکرایا۔ جو بھولے بسرے بھی خدا کا نام زبان پر نہ لائی۔ اس وقت عارف کے غلاموں کی غلام اور خدا کی ہر مخلوق کو خدا کا محبوب سمجھ رہی تھی۔ جانتی تھی کہ بچے دونوں مر چکے تھے۔ ان کی ہڈیاں گل کر خاک ہو گئیں۔ مگر اب بھی جب کبھی ماں کی ہوک اٹھتی اور کلیجہ کی آگ بھڑکتی تو وہم ہو جاتی۔ دل ہی دل میں باتیں کرتی۔ خاموش ہوتی۔ بلبلاتی۔ تڑپتی پھڑپھڑاتی اور ہائے کر کے بے ہوش ہو جاتی! جوش آتا، کچھ دیر دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھتی، درختوں سے، پرندوں سے، دیواروں سے خطاب کرتی التجا کرتی، پھر ایک پھریری لے کر آسمان کی طرف دیکھتی اور کہتی :-

"اس سے بہت زیادہ سزا کے قابل ہوں"

یہ وہ حالت تھی کہ رستہ چلتے بھی بدنصیب کو دیکھ کر رحم کھاتے۔ اس کے جگر خراش نالے اور حسرت آمیز نظریں دل کے پار ہوتی تھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے اپنی طرف سے ہر چند کوشش کی کہ خالق کے سامنے مخلوق کو بھول جاؤں اور خاص حد تک کوشش میں کامیاب بھی ہوئی۔ مگر ماں تھی۔ بچے بھی چھوٹے نہیں، پلے پلائے جب خیال آتا۔ تڑپ اٹھتی اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتی

(۱۰)

توقیر:- "ایک موٹی سی موٹی عقل کا آدمی بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا جو آپ جیسی سمجھ دار عورت کی زبان سے نکل رہی ہے۔ زلیخا اور فاطمہ دونوں کو اگر اس معاملہ میں شکایت ہو سکتی ہے تو خدا سے جس نے یہ حالت کر دی ہم اس معاملہ میں بے قصور ہیں۔ بھائی جان کی موت کوئی اچنبھا نہیں، دنیا مرتی ہے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہوتا کہ مرد کے بعد عورت کے پاس دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہے۔ اس بربادی کے ذمہ دار بھائی باپ ہیں نہ آپ۔ زلیخا اور صرف زلیخا! فاطمہ کی حالت غیر معمولی مصیبت نہیں۔ آدمی

توقیر۔ "اس سے بحث نہیں۔ لڑکی والوں کی یہ ضد ہے کہ پہلی بیوی کو طلاق دو۔"
بلقیس:۔ "لڑکیاں بہت ہیں، یہیں کیا لال لگے ہوئے ہیں؟"
توقیر۔ "اس کو میں تم سے بہتر سمجھ سکتی ہوں۔"
بلقیس۔ "مگر سمجھا نہیں سکتیں۔"

بلقیس، احسان اور توقیر تینوں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ احسان کے نکاح کی تجویز تھی۔ اور احسان کے دوسرے نکاح کی پہلی شرط یہ تھی کہ فاطمہ کو طلاق دے کہ احسان کا باپ دروازہ میں آیا اور بیوی سے کہا:۔ "تم ذرا میرے پاس آؤ۔" توقیر اٹھ کر ادھر گئی تو احسان نے چچی کی طرف دیکھا اور کہا۔

احسان۔ "آپ کو جس وجہ سے اصرار ہے میں خوب سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔"
بلقیس:۔ "تم سمجھتے تو اچھا ہی نہ ہوتا۔ تمہاری مجبوری یقیناً غلط ہے۔"
احسان۔ "چچی جان یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟"
بلقیس۔ "کیا کہہ رہی ہوں؟"
احسان۔ "آپ مجھ سے وہ توقع کرتی ہیں۔ جو انسان کے اختیار سے باہر ہے۔"
بلقیس۔ "میں دیوانی نہیں ہوں۔"
احسان۔ "یہ تو میں نہیں عرض کرتا۔"
بلقیس۔ "صریحاً کہہ رہے ہو احسان! کیا احسان دنیا میں کوئی معنی نہیں رکھتا؟"
احسان۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں صاف صاف عرض کروں۔"
بلقیس۔ "ضرور۔"
احسان۔ "دیکھئے اول تو میں اس رائے سے ہرگز متفق نہیں کہ فاطمہ جیسی لڑکی اتنا بڑا کام کر سکتی ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ ضرور اس کی کچھ وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا مرض ہی ہو میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ فاطمہ نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر مجھ کو بچایا۔

ہی بیمار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ستم نہیں ہوتا کہ صورت سے بے صورت ہو جائے آپ خود دیکھ رہی ہیں۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سب سے بڑی آفت یہ کیسی ہے کہ مرض متعدی ہے۔ آپ کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہی ہیں کیا میں جان بوجھ کر سارے خاندان کو کوڑھی بنا دوں۔ نا بیوی ایسی اللہ والی میں نہیں ہوں۔"

احسان۔ "چچی جان آپ خود معاملہ پر غور فرمائیے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ محض ایک آدمی کی دل شکنی کے واسطے دنیا اپنی تمام ضرورت ختم کردے اور اس لئے کہ فاطمہ کا دل نہ دکھے میں دوسرا نکاح نہ کروں۔"

بلقیس۔ "یہ تو میں نہیں کہتی۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ اور ہے۔ میں تو صرف طلاق کے متعلق کہہ رہی ہوں۔"

احسان۔ "یہ خواہش بھی ہرگز قبول نہیں ہو سکتی۔"

بلقیس:۔ "وہ کیوں؟"

احسان:۔ "اس کے نکاح میں رکھنے سے مجھے کیا فائدہ؟"

بلقیس:۔ "نقصان کیا ہے؟"

احسان:۔ "میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں، چچی جان جب امید منقطع ہو گئی تو واسطہ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے۔"

بلقیس:۔ "انسانیت۔"

احسان:۔ "لاحول ولا قوۃ۔"

بلقیس:۔ "اس میں تمہارا نقصان تو ہے نہیں؟"

احسان:۔ "ایک یہی ہے کہ اس کے مصارف کا ذمہ دار میں رہوں۔"

بلقیس:۔ "اگر اس کا اطمینان ہو جائے کہ یہ بار تم پہ نہ پڑے گا؟"

احسان:۔ "میں مسلمان ہوں اور حشر میں گنہگار ہوں گا۔"

اور اگر بالفرض میں تسلیم بھی کرلوں تو احسان کا جو معاوضہ آپ تجویز فرمائیں حاضر ہوں۔"

بلقیس۔ "جب تم تسلیم ہی نہیں کرتے تو پھر بحث فضول ہے۔ تم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا اور مجھ سے کہا۔ لیکن اب تم بہت زیادتی کرتے ہو کہ اس کے ایسے زبردست ایثار اور بے مثل قربانی کو خاک میں ملا رہے ہو؟"

احسان۔ "اچھا یوں ہی سہی، پھر میں اس کا کیا معاوضہ ادا کروں؟"

بلقیس۔ "کیا تم اس کے واسطے واقعی تیار ہو؟"

احسان۔ "حتی الامکان"

بلقیس۔ "جس طرح وہ تمھاری وجہ سے خاک میں ملی تم اس کی وجہ سے خاک میں مل جاؤ۔"

احسان۔ "یعنی کیا کروں؟"

بلقیس۔ "اس سے وفا کرو۔"

احسان۔ "میں کیا دغا کر رہا ہوں؟"

بلقیس۔ "یہ دوسرا نکاح"

احسان۔ "میں انسان ہوں۔ فرشتہ نہیں ہوں"

بلقیس۔ "میں تم کو انسان ہی سمجھتی ہوں"

احسان۔ "مگر آپ مجھ سے وہ توقع رکھتی ہیں جو کوئی انسان نہیں کر سکتا۔"

بلقیس۔ "شاید ایسا ہی ہوگا۔"

احسان۔ "چچی جان بخیال تو فرمایئے۔ میں بچہ ہوں۔ میں نے ابھی دنیا کا کیا دیکھا ہے۔ میرے پہلو میں دل ہے۔ دل میں ارمان ہے۔ کیا میں ایسی عورت کے ساتھ جس کی صورت دیکھ کر جی متلائے زندگی بسر کردوں اور میں کسی کام کا نہ رہوں؟"

بلقیس۔ "تم نے اس برائی کے ساتھ جو بیان کی اس کی کچھ بھلائیوں کا بھی ذکر کیا ہوتا۔"

احسان۔ "آپ بے دے کر وہی ایک رونا لے بیٹھیں جس کا میں جواب دے چکا ہوں۔ اور

اس کا معاوضہ بھی ادا کر چکا ہوں۔ یہ بحث دوسری ہے کہ اس نے غور نہیں کیا۔"

بلقیس "تمھیں کیا معاوضہ ادا کرنا چاہیے تھا؟"

احسان "میں نے دو مرتبہ آدمی بھیجا کہ اگر خرچ کی ضرورت ہو تو منگوا لو مگر اسنے انکار کر دیا۔"

اب بلقیس کچھ دیر خاموش رہی اور حیرت سے احسان کا منہ تکنے لگی۔ اس کے بعد اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور کہا:-

احسان ذرا گریبان میں منہ ڈال کر بات کرو۔ مجھے امید نہ تھی کہ ایسے کم ظرف اور چھچھورے ہو گئے۔ تم نے اب تک فاطمہ کو نہ پہچانا۔ وہ تمھاری محسن ہے! تم کو ماں کے پیٹ سے پیدا کرنے والا خدا اور زندگی عطا کرنے والی فاطمہ! وہ وقت یاد کرو جب مجبور و لاچار ایک پلنگ پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ زندگی کوئی دم کی مہمان اور موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ یہ وقت تھا کہ ماں جیسی عاشق زار اور باپ جیسا غمگسار دونوں الگ ہو گئے۔ طبیب اور ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ عزیز و اقارب مایوس ہو گئے ایسی حالت میں کہ دنیا تمھاری موت کا یقین کر چکی تھی۔ ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا کہ تمھارے کام آتا اور خون کے چند قطرے تمھاری نذر کرتا۔ احسان وہ وقت نہ بھولو! جب موجودہ دنیا تم کو رخصت کر چکی اور زندگی کے ہر ذرے نے تم کو خیر باد کہہ دیا۔ اس وقت وہی منکوحہ۔ بدنصیب فاطمہ تھی جس نے اپنی جان قربان کی اور خود مصیبت میں پھنس کر تم کو زندہ رکھا! اس کی تباہی، اس کا مرض، اس کی علالت، تمھاری موجودہ زندگی کا کرشمہ ہے۔ ضرورت تھی، اگر انسانیت ہوتی۔ مناسب تھا اگر عقل رکھتے۔ فرض تھا اگر غیرت ہوتی کہ اس کے قدم آنکھوں پر رکھتے! کیسی خرچ کی ضرورت اگر زر و جواہر بھی اس کو تول دیتے تو اس کا احسان اترنے والا نہ تھا۔ وہ اگر تمھاری کھال کی جوتیاں بناتی تو تم کو عذر نہ ہوتا۔ افسوس صد افسوس تمھاری حالت اور فراست پر کہ اس کی زندگی میں تم دوسرا نکاح کرو! لعنت ہزار لعنت تمھاری جوانی پر کہ تم اس

منہ سے اس کو طلاق دو۔ موت جس کے چنگل سے آج بیوی کی بدولت بچ گئے ایک روز جان لے کر پیچھا چھوڑے گی۔ جوانی فانی ہے اور قضا اٹل۔ تم اور وہ دونوں یہاں سے رخصت ہونے والے ہو۔ مگر یقین کر لو کہ موت تمھارے فانی جسم کے واسطے ہے تمھارے اعمال زندہ رہیں گے۔ اور دُنیا کے دور آیندہ میں جب تمھاری اور اس کی یادگار کچھ رہ رہیں موجود ہوں گی۔ چند گردنیں نیچی اور بعض سربلند ہوں گے۔ وہ ذریات جو تمھاری قابل ملامت ہستی دنیا میں چھوڑے گی اور وہ اضافہ جو اس کی لائق ناز زندگی سے دنیا میں ہوگا۔ تمھارے اور اس کے بعد تمھاری اور اس کی زندگی کا نتیجہ ہونگے اس وقت دیکھنے اور سننے والے دونوں زندگیوں کا فیصلہ کریں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمھارے کان اس وقت اس قابل نہ ہوں گے کہ پھٹکار کے ان نعروں کو اور ملامت کے ان شراروں کو جو آسمان برسائے گا اور زمین اگلے گی۔ سن سکیں گے۔ تمھاری آنکھیں اُس وقت اس لائق نہ ہوں گی کہ مردوں کی اس حقارت کو اور عورتوں کی اس لعنت کو جو تمھارے نام اور کام پر زندہ دنیا کے ہر گوشے سے ظاہر ہوگی۔ دیکھ سکیں گی۔ مگر احسان اس وقت تم شیطان اور نمرود کی طرح مردود ہو گے۔

جس طرح یزید کی قبر آج ہر مسلمان کے پتھروں کا نشانہ ہے۔ اسی طرح زمین کا وہ حصہ جہاں تمھاری ناپاک ہڈیاں دفن ہوں گی۔ لعنت کے ڈھیر اور ملامت کے انبار سے لبریز ہوگا اور اسی سرزمین کا وہ حصہ جس کی آغوش میں فاطمہ کا مبارک جسم آرام کرے گا بے شمار جواہرات سے مالامال ہوگا۔ اجنبی سیاح جو تمھاری قبر روندے گا فاطمہ کے مزار کو بوسہ دے گا اور تمھاری زندگی شوہروں کے واسطے سبق۔ مگر اس کی، بیویوں کے واسطے نمونہ ہوگی۔ اگر زندگی نام ہے نفسانی خواہشوں کے پورا ہونے کا، تو تو جانوروں کی زندگی سب سے بہتر۔ مگر نہیں۔ احسان! زندگی کے معنی ہیں موت کے بعد کچھ چھوڑنا۔ جو مرنے والے کی یاد زندہ رکھے۔ فاطمہ دنیا سے بہت کچھ کما چکی۔ وہ دنیا

سے بامراد اٹھے گی اور خدا کے حضور میں سُرخ رُو جائے گی۔ اس کا چہرہ روشن اس کی گود بھری ہوگی۔ احسان! ضرورت ہے کہ تم انسانیت سے کام لو اور فاطمہ کو دکھا دو کہ اگر مشرقی بیویاں شوہر پر قربان ہونا فخر سمجھتی ہیں تو شوہر بھی اس شمع پر پروانہ وار نثار ہوتے ہیں۔

تمہاری آنکھوں میں پھلیاں ہیں۔ تمہارے کانوں میں ٹینٹ ہیں۔ تم اندھے ہو اور بہرے ہو کہ تم کو اب تک معاملہ کا علم نہیں۔ میں تم کو بتاتی ہوں اور گو مجھ کو اجازت نہ تھی۔ لیکن مصلحت یہی ہے۔ سنو، خدا کا فضل اس کے ساتھ ہے وہ بالکل تندرست ہوگئی اور اب تمہاری شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ زلیخا کی چوکھٹ سے فاطمہ کو اس طرح بیاہ کر لاؤ کہ وداع کے وقت تمہارا سر اس کے قدموں پر ہو۔

یہ مبالغہ نہیں ہے کہ فاطمہ ایک چاند ہے جو حسینی خاندان میں چمکا۔ ایک پھول ہے جو زلیخا کے گھر میں مہکا! مبارک ہوگا وہ گھر جو اس دلہن کے قدم سر آنکھوں پر رکھے اور خوش نصیب وہ شوہر جو اس بیوی کی مقدس ہستی کا مالک ہو۔"

(۱۰)

دسیم دلہن کی صحت اچنبھا یا حیرت تو نہیں خدا کی قدرت ضرور تھی۔ حالت بے ہوشی میں خوفناک صورتوں کا نظر آنا۔ ڈرنا۔ بہکنا۔ چیخنا۔ چلانا۔ یہ سب اس کے اپنے کرتوت تھے۔ وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتی ہو۔ مگر دیکھنے والے دیکھ اور سمجھ رہے تھے کہ عمر کے تمام افعال و اعمال اس وقت ایک ایک کرکے سامنے آرہے ہیں، اور وہ خیالات جن میں ہمیشہ منہمک رہی اس وقت پیش نظر ہیں۔ یہی ہے وہ اصول جو حدیث رسولؐ کے بموجب دم واپسین میں کامیابی و ناکامی کا فیصلہ دنیا کو دکھا دیتا ہے۔ حقیقتاً سکرات بھی نیند کی طرح ایک قسم کی بیہوشی ہے جو انسان کو علائق دنیوی

سے قریب قریب آزاد کر دیتی ہے۔ مگر وہ خیالات جو ہر وقت دماغ میں بھٹکتے رہے اس خاص حالت میں بھی ایک صورت اختیار کر لیتے ہیں، اسے خواب کہو، سرسام سمجھو، فرشتے خیال کرو، جو چاہو سمجھو اور جو چاہے کہو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب دماغ نے تمام معاملات دور کر دیے اور وہ قریب قریب بے کار ہو گیا تو اس لئے کہ ابھی اس میں قوتِ تخیلہ باقی ہے وہ صرف اسی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ جو زندگی کے بیشتر حصہ میں اس کا ہم نشین رہا۔ وسیم دلہن کی ظاہری حالت سکرات کی سی تھی۔ مگر درحقیقت موت ابھی اس سے دور تھی اور یہ جو حالات اس کیفیت میں اس کے سامنے تھے اس کا اپنا تخیل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ موت کا ٹالنا محال۔ لیکن ہماری رائے تو یہی ہے اور رائے کیسی یقین کہ وسیم دلہن کی پاداش میں جو مصیبت یا عذاب خواہ وہ موت کی صورت میں یا کسی اور طرح نازل ہوا تھا عمل صالح اس کے روکنے میں کچھ نہ کچھ کام آیا اور ضرور آیا۔ تندرست ہوئی تو مؤاخذۂ عاقبت کے سوا جس میں کبھی کبھی بچوں کی موت کا صدمہ اپنی جھلک دکھاتا تھا اور کوئی دھڑکا نہ تھا۔ یہی ایک یقین یعنی موت اور بعد الموت، اگر دل پر جم رہے تو آدمی انسان پیدا ہو کر فرشتہ مرے۔ ہر نیک عمل جو کامیابی کا زریں تاج سر پر رکھ کر مُردے کو قبر میں دفن کرے ثروتِ خدا کی تہ میں موجود ہے۔ وسیم دلہن کے دل کا خدا کی طرف رجوع ہوتا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کایا پلٹ گئی۔ نسیمہ کے بوئے ہوئے بیج دل میں موجود تھے اور گو صحبت کی مدت بہت قلیل تھی۔ مگر جڑ اتنی زبردست تھی کہ صلاحیت پیدا ہوتے ہی ایسے پھولے کہ سر سے پاؤں تک ان ہی کا گھن چھایا ہوا تھا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ مرنے والی ساس جس کی آنکھیں خدا کے خوف سے ہر وقت روئیں۔ دنیا سے اس طرح اٹھی کہ ہر آنکھ اس کی موت پر خون کے آنسو گرا رہی تھی۔ اس کی زندگی کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس کو یاد تھا کہ جان بچہ کی صورت جس کو قبر میں سلا چکی تھی۔ ساس نے بیوہ عورتوں کے زخموں اور یتیم بچوں کے ٹکڑوں میں ڈھونڈھی اور اس نے اپنی حالت پر

ایک مفصل نظر ڈالی تو خود سر سے پاؤں تک اور اعمالنامہ ابتدا سے انتہا تک گناہوں میں غرق اور خود غرضی میں لتھڑا ہوا تھا۔ آج اس کو اسلام کی قدر اور خدا کی وقعت معلوم ہوئی۔ گناہوں کی بھاری گٹھری، ایک ادنےٰ اعتراف میں پھول سے زیادہ ہلکی اور کالا سیاہ اعمال نامہ معمولی احساس ندامت سے دھویا دھایا صاف تھا۔ اس نے اس سلسلہ میں احکام اسلام کا مطالعہ کیا۔ علماء سے صلاح لی، کتابوں سے مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ خدا کی رضامندی، خلق خدا کی رضامندی ہے۔ حیات انسانی کی حقیقی کامیابی تعلقات کی تہ میں اور فلاح دارین کا پورا سہرا معاملات کے سر۔ مگر اندیشۂ عاقبت اس بری طرح ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑا تھا کہ رات اور دن، صبح اور شام ہر وقت خدا کا خوف اس کے پیش نظر تھا۔ نسترن اگر عاقبت اندیش عورت نہ ہوتی تو تعجب نہیں۔ محلہ وسیم دلہن کے اس خبط کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دیتا۔ مسلمان عورتوں کے واسطے کسی مرد یا عورت کا پاگل ہونا ولی اللہ یقین کرنے کو کافی ہے۔ مصیبت آ کر یہ پڑی ہے کہ اس گروہ کے سامنے جو حقیقتاً نہیں، بزعم خود تعلیم یافتہ ہے۔ اگر خدا ابھی ایک دفعہ چلا آئے تو وہ بندہ ہی سمجھیں۔ اور جاہلوں کے سامنے اگر بندہ بھی خدا کے بھیس میں نکل پڑے تو وہ بلا تامل اس کی صدا پر لبیک کہہ اٹھیں! اس امتیاز کو پرکھنے کی کسوٹی صرف عقل سلیم اور وسعتِ نظر ہے۔ اس قسم کے مواقع اکثر نہیں تو کبھی نہ کبھی ہر عورت کو پیش آجاتے ہیں اور یہ واقعی نازک وقت ہوتا ہے۔ یعنی مکار ایسا ستم کرتے ہیں کہ گھر کی حالت، عزیزوں کے نام بچوں کی تعداد غرض تمام کچا چٹھا کسی طرح معلوم کر لیا اور ولی بن کر آموجود ہوئے۔ چند ایسے بھی ہوتے ہیں کہ واقعی ضرورت لے کر آئے۔ مگر اس لئے کہ دل کھٹکا ہوا اور طبیعت اچٹی ہوئی ہوتی ہے، یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں یہ یقین کرنے کے بعد کہ خدائی اختیار میں نبی اور پیمبر، ولی اور بزرگ سب لاچار ہیں

مدعی کا مقصد دیکھنا اور غور کرنا ہے۔ وسیم دلہن اپنی موجودہ حالت میں کہ بسا اوقات وہ دوزخ کے خوف سے بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے تھرا اور چلا اٹھتی تھی۔ دن دن بھر اور وہ بھی مسلسل رونے۔ رات رات بھر اور وہ بھی متواتر ذکر خدا میں مصروف و منہمک رہتی اگر وہ دنیا کمانا چاہتی تو کنبے اور کنبے کیا ہمسائے اور محلے بلکہ شہر اور پر شہر والیاں اس کے قدم لیتیں اور پاؤں چومتیں۔ سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلے نسترن کی ماں ایمان لائی اور بیٹی سے کہنے لگی۔

"کیا خدا کی شان ہے! عمر اس طرح گزری اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جو کہتی ہے وہی ہوتا ہے۔ پرسوں جانماز اٹھا کر اندر لے گئی کہ مینہ برسے گا۔ دیکھ لو کیا چھاجوں پڑا ہے"

نسترن تو خاموش ہو گئی۔ مگر شدہ شدہ یہ چرچا دور دور پہنچا اور عورتیں آنی شروع ہوئیں۔ انجام نہ معلوم کیا ہوتا مگر۔ مگر نسترن نے آنے والیوں کو ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ منہ تکنے لگیں اور تعجب نہیں کہ عمر بھر پھر کبھی اس بدعت کا نام نہ لیا ہو۔

(۱۲)

ایک خاموش گھر میں جس کے در و دیوار سے افلاس کا اظہار ہو رہا ہے اور کونہ کونہ سے مصیبت ٹپک رہی ہے۔ زلیخا بستر مرگ پر پھٹی ہوئی رضائی اوڑھے پڑی ہے۔ آدھی رات کا سنسان وقت ہے اور فاطمہ خاموش بیٹھی اس رخصت ہونے والی ماں کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ برابر کے طاق میں ایک مٹی کا چراغ ٹمٹما کر رات کی سیاہی میں بجلی کا کام کر رہا ہے دنیا آ کر دیکھتی تو زلیخا کا دم واپسیں اس کی ہم جنسوں کے واسطے درس عبرت تھا۔ جن ہاتھوں نے زر و جواہر لٹایا۔ اشرفیوں میں لوٹے۔ روپوں میں کھیلے اور دولت میں لوٹے وہ اس وقت ایک ایک پیسہ کو محتاج تھے! فانی زندگی اس کی فضول خرچی اور ناعاقبت اندیشی کا مرثیہ پڑھ پڑھ کر دنیا سے رخصت کر رہی تھی! ہمارا دل، ہمارا ایمان ہماری طبیعت فاطمہ کی دل آزاری گوارا نہیں کرتی۔ مگر حق یہ ہے کہ زلیخا

کی موت خبر دے گئی ان لڑکیوں کو جو وقت کا طفیل کہو۔ تقدیر کی خوبی سمجھو یا ماں باپ
کی عنایت خیال کرو۔ غرض کسی نہ کسی وجہ سے بڈھے دولت مند شوہروں کے پلے
پڑتی ہیں۔ حسن مر چکا اور زلیخا مر رہی ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ زلیخا
کی بربادی اور فاطمہ کی تباہی کا بار صرف زلیخا کی گردن پر ہے۔ مرنے والا حسن
بہت کچھ بے قصور اور فاطمہ بے گناہ! زلیخا کی آنکھیں اس وقت مرض الموت میں
بند اور اس کا دماغ اس آخر وقت میں بے کار تھا۔ مگر یہ آنکھیں اور یہ دماغ کبھی کام بھی
کر رہے تھے اور زلیخا اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کہ دن ہمیشہ رہنے والے اور یہ راتیں سدا
ٹھہرنے والی نہیں۔ یہ آفتاب ڈھلنے والا اور یہ چاند گہنے والا! یہ پھول سدا بہار اور
روشنی پائدار نہیں۔ خزاں فکر میں اور انقلاب تاک میں ہے۔ حسن اپنی زندگی کا بڑا حصہ
ختم کر چکا۔ میری زندگی اب شروع ہوتی ہے۔ مجھے اس کے بعد اسی دنیا میں رہنا اور
ضرورتیں پوری کرنی ہیں۔ مردوں کے جس گروہ نے مجھ کواری اور چھڑی کو نہ قبولا،
وہ بیوہ اور بچوں والی پر کیوں توجہ فرمائیں گے۔ یہ نکاح اس لئے کرتے ہیں کہ بیوی جائداد
غیر منقولہ ہو، صورت شکل والی، روپے پیسے والی۔ اپنی حیثیت دمڑی کی نہ ہو مگر بیوی
لکھ پتی ہو۔ یہ ایسے کھلے ہوئے مشاہدے، روشن معاملات اور صاف باتیں تھیں کہ
اندھے سے اندھا بھی دیکھ اور الو سے الو بھی سمجھ سکتا تھا۔ نہ دیکھا اور نہ سمجھا تو پھر
شکایت کیسی اور رونا کس کا۔ غضب خدا کا دن رات کی رسمیں تھیں اور ایک
ایک رسم پر نیک بخت نے وہ دریا دلی کی کہ توبہ بھلی۔ آج عقیقہ ہے کل غسل
صحت ہے۔ پرسوں دانت داڑھیں ہیں! مختصر یہ کہ روز کی رسمیں اور ہر وقت کی
شادی! اس ابتدا کی انتہا اور اس آغاز کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ حسن مر گیا۔ مگر
یہ واقعہ ہے کہ اس نے ایک دفعہ نہیں، بارہا بیوی کو بتایا اور دکھایا کہ یہ الٹے تلتے۔ یہ ٹھٹ
اور رسمیں برا دن دکھائیں گی۔ ہاتھ روکو اور دل مارو۔ مگر اس کے کان پر جوں نہ

چلی۔ اور اثاثہ ارمانوں پر اور رسموں پر لٹا لٹو، ہاتھ جھاڑ بیٹھی۔

فاطمہ لڑکی ضرور تھی اور ناتجربہ کار بھی۔ مگر ایسی چھوٹی اور ایسی بچہ نہ تھی کہ ماں کی غلطیوں کا اُسے احساس نہ ہوتا ہو۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ ساری مصیبت ماں کے اپنے ہاتھ کی لائی ہوئی ہے۔ باپ خدا اس کو غریقِ رحمت کرے ہمیشہ کہتا اور سمجھتا رہا۔

دنیا کا ہر واقعہ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے واسطے بہت کچھ چھپا کر رہا ہے موت مرنے والے کے نہیں دیکھنے والوں کے واسطے سبق ہے کہ جو ٹانگیں کل تک زمین پر سیدھی طرح قدم نہ دھرتی تھیں وہ کس حسرت و یاس سے چمٹ کر آپس میں جدا ہو رہی ہیں۔ اور جن آنکھوں میں کبھی مروت اور محبت چھو تک نہ گئی وہ کیوں کر ڈگر ڈگر کرتی فنا ہو رہی ہیں۔ زلیخا بدنصیب کی ہستی جس کے مردے کو ایک فاطمہ کے سوا کوئی رونے والا تک نصیب نہ ہوا۔ ختم ہوتے وقت لڑکی کو دکھا اور دوسروں کو سنا رہی تھی کہ بد دماغی، کج خلقی، خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی کے نتائج یہ ہیں کہ وطن کی سرزمین پر جہاں اپنے اور پرائے، کنبہ اور محلہ سب موجود ہے ایک متنفس میسر نہیں جو دم واپسیں میں یٰسین سنا دیتا۔ یہ نہ تھا کہ فاطمہ ان باتوں کو سمجھ اور اس انجام کو پرکھ نہ سکتی ہو۔ وہ عقل کے آئینہ میں ماں کی غلطیاں روز روشن کی طرح دیکھ رہی تھی۔ مگر معاملہ نازک، اور وقت آخر تھا۔ شفقت اور محبت غالب تھی اور اس کا دل گوارا نہ کر سکتا تھا کہ وہ اس ماں کی جو اب اس کے پاس چند لمحہ کی مہمان ہے کسی فعل کو بھی غلط سمجھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ فاطمہ جیسی سنجیدہ بچی بھی دامن صبر ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔ رات آدھی سے زیادہ ختم ہو چکی تھی۔ فاطمہ کا زلیخا کے سوا کوئی نہ تھا۔ باپ کی موت نے ددھیال کے تعلقات اور ماں کی بے وقوفی نے ننھیال کے سارے معاملات ختم کر دیئے تھے اور اب نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ کوئی آکر جھانکتا تک نہ تھا۔ پڑوسی تو تھے کس گنتی میں۔ حقیقی رشتہ داروں کی یہ حالت

تھی کہ رُخ کرنا قسم، رات کے اس سناٹے میں غریب بچی تن تنہا ماں کو لئے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ مجھ جیسا بدنصیب اس دنیا میں کم ہوگا۔ باپ جس کی شفقت دل کا مرجھایا ہوا کنول کھلا دیتی تھی۔ مرچکا۔ ماں جس کی محبت ہر تکلیف اور رنج کو زائل کر دیتی تھی، اس وقت جدا ہوتی ہے۔ شوہر جس کی عنایت ان صدمات کی تلافی کر دیتی۔ صورت سے بیزار ہے۔ اب میں ہوں اور یہ دنیا۔ دُنیا ہے اور غم۔ عمر ہے اور مصیبت! مگر خیر اور تو جو آئے گی وہ بھگتوں گی۔ جو پڑے گی وہ سہوں گی۔ مگر آج قدرت مجھ سے وہ نعمت چھینتی ہے۔ جس کا بدلہ دنیا کی کوئی دولت اور کوئی نعمت نہیں دے سکتی۔ کیسی رفیق اور شفیق ماں کہ ذرا سی پھانس چُبھ جاتی تو مجھ پر جان قربان کرنے کو تیار تھی۔ مجھ سے زیادہ غافل کون ہوگا کہ رتی بھر خدمت نہ کر سکی۔ اب یہ کہاں اور میں کہاں۔ دنیا راحت و آفت کا گھر ہے کہ آگے چل کر دُکھ ہے یا سُکھ اور عیش ہے یا غم۔ مگر چھٹنے والی ماں اپنے ساتھ خوشی کا بڑا حصہ کم کر رہی ہے۔ دکھ میں اس سے بڑا ہمدرد اور سکھ میں اس سے زیادہ خوش ہونے والا میسر نہیں ہو سکتا۔

ان خیالات میں کچھ دیر غرق رہنے کے بعد فاطمہ کے دل میں کچھ ایسی ہوک اٹھی کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "پندرہ ہی دن کی بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ مر جاؤ گی تو کیا دنیا سونی ہو جائے گی"۔ ہائے میرا منہ پھوٹ جاتا۔ میری زبان گل جاتی کہ میں اس چند روزہ مہمان کو خوش اور راضی رکھنے کی بجائے ایسی زبان درازی کرتی دنیا سونی نہ ہو۔ مگر میرے دل کی بستی تو سونی ہو گی۔ ذرا میرے سر میں درد ہوتا تھا۔ تو بے چین ہو جاتی تھیں۔ میں اس شفقت اور محبت کا معاوضہ جس نے ایک گوشت کے لوتھڑے کو خونِ جگر پلا کر اور اپنی راحت مٹا کر انسان بنا دیا کیا خاک کر سکتی ہوں لیکن انسانیت کے یہ معنے نہ تھے کہ تمام حقوق خاک میں ملا کر فرنٹ ہو جاؤں"۔

یہ کہہ کر فاطمہ نے پھر ماں کی طرف دیکھا تو آنکھیں بند تھیں اور سانس ڈہرا

ہو کر جل رہا تھا۔ ناتجربہ کار بچّی، ماں کی سکرات نہ پہچان سکی اور محبت کے جوش میں لپٹ گئی۔ آوازیں دیں، جگانے کی کوشش کی۔ جب کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ شربت کا بچیچہ جو شام ہی سے منگا کر رکھ دیا تھا، حلق میں ڈالا۔ مگر ایک ہی بوند نیچے اتری تھی کہ زلیخا کو اُچھو ہوا۔ آنکھیں پھر گئیں اور دم نکل گیا۔

(۱۳)

وسیم دُلہن کے دل میں مواخذۂ عاقبت کا دھڑکا ایسا جاگزیں اور تہہ نشین ہوا تھا کہ وہ قریب قریب تمام تعلقات منقطع کر چکی تھی۔ کھانے کا فکر تھا نہ پینے کا خیال کسی چیز کا ہوش نہ کسی بات کا ملال۔ آنکھوں میں قبر کی صورت۔ دماغ میں منکر نکیر کا سوال اور دل میں موت کا فکر۔ قدموں میں جانماز۔ ہاتھ میں تسبیح۔ لب پر خدا کا ذکر۔ گھر میں ماشاءاللہ دس بارہ آدمی تھے۔ مگر اس کو کسی سے واسطہ نہ تھا۔ نسترن تو خیر سوکن تھی۔ عارف کی صورت دیکھنے کا دنوں کیا، ہفتوں اتفاق نہ ہوتا تھا۔ یہاں اتنا کہنا پڑے گا کہ اب یہ خدا جانے کہ نسترن کی تحریک سے یا اپنے دل سے اور رحم کھا کر یا حق سمجھ کر، مہنسی خوشی یا اوپری دل سے عارف نے اپنی طرف سے اس موقع پر وسیم دلہن سے مصالحت کی پھر کوشش کی۔ مگر اب وسیم دلہن کے دل کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ مجبوراً عارف بھی خاموش ہو گیا۔ تاہم وہ یہ دیکھ کر بھی کہ مطلق توجہ نہیں کرتی۔ روزانہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو بلاناغہ آتا اور بیٹھ کر چلا جاتا۔

بیت اللہ سے واپس آکر اور بھتیجی کے حالات سن کر وسیم دلہن کے حقیقی چچا حاجی امداد حسین صاحب اس سے ملنے تشریف لائے تو انھیں بھی اپنی داستانِ مصیبت سنا کر منزلِ مقصود پر پہنچنے کا راستہ پوچھا۔ حاجی صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمانے لگے:۔

میں نے تمھارے حالات سنے معتبر زبانوں سے اور معقول انسانوں سے تعجب

ہوتا ہے کہ کس طرح شیطان نے تمھارے دل پر قبضہ، تمھارے دل پر قبضہ، تمھارے دماغ پر تسلط اور تمھاری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور تم ایک عرصہ تک خدا سے ایسی فرنٹ رہیں کہ اس کے کمزور بندوں اور مظلوم آدمیوں پر طرح طرح کے ظلم اور وضع وضع کے ستم توڑے۔ میں تمھاری زندگی کے ہر واقعہ سے اچھی طرح واقف اور پوری طرح آشنا ہوں۔ تم سے زیادہ نافرمان بیوی، ناہنجار ماں اور جفاکار انسان کون ہوگا کہ تمھاری غفلت لاپروائی اور مظالم کی یادگاریں دنیا میں موجود ہیں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ تم جانو اور تمھارا خدا۔ مگر زندگی میں جو کچھ چھوڑ چلیں وہ کیا ہے۔ تم فنا ہو جاؤ اور ہو گیا جاؤ ہونا ہے لیکن جو کچھ کر گئیں، وہ فنا ہونے والا نہیں۔ تم اور تمھاری زندگی۔ عارف اور نسترن، اسلام اور سلیم، فاروق اور حفیظ اور نہ معلوم کون کون، سب مر جائیں، لیکن جو سلوک تم نے ان لوگوں سے کیا اور جو مظالم تم نے ان پر توڑے وہ بہت روز تک باقی رہیں گے۔ تم جس خدا کی تلاش میں ہو وہ تم سے دور نہیں، تمھارے پاس، آسمان پر نہیں، تمھارے قریب، تمھارے گھر میں، تمھارے دل میں موجود ہے۔ سچے دل سے ڈھونڈو پاؤگی، صداقت سے تلاش کرو مل جائے گا۔ غلط راستہ پر نہ چلو اور اصول سے الگ نہ ہٹو۔ وہ بدنصیب بیبیاں جن کے وارث سروں سے اٹھ گئے، وہ کچھ دل سے ٹکڑے جن کو پیار کرنے والا کوئی نہیں، وہ اپاہج لاچار جو بے یار و مددگار ہیں، ہماری نگاہوں میں ذلیل اور رذیل سہی، مگر یہ خدائی کا وہ چمنستان ہے جس کی مہک ایک دنیا کو معطر کر رہی ہے، خدا ان بیویوں میں اور خدا کی رضامندی ان ٹکڑوں میں موجود ہے۔ تم نے خدا کی لہلہاتی کھیتی اجاڑ دی اور ہرے بھرے پودوں کو تاراج و برباد کیا، کیاری باغبان کی ملکیت ضرور تگہ پڑے اور پتے بھی جان رکھتے تھے۔ قصور تمھارا اور معاف کرنے والی میں، ظلم کرو مخلوق پر اور معافی چاہو خالق سے غلط راستہ، ٹیڑھا اصول، کھلی ہوئی غلطی، علانیہ بھول۔ کلیجہ سے لگاؤ فاروق کو آنکھوں پر بٹھاؤ حفیظ کو۔ قدموں میں گرو عارف کے، معافی مانگو نسترن سے۔

وسیم دلہن بیٹی! میں نے جس وقت تمہارے حالات سنے ہیں کلیجہ کانپ گیا، کس باپ کی بیٹی اور کس دادا کی پوتی۔ کیا تم کو بڑے مولوی صاحب یاد نہ ہوں گے ؟ دادا وہ تھے کہ ٹنڈے حمید کو بارہ سال دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ پوتی تم ہو کہ یتیم فاروق کو لہولہان کر دیا۔ ایک وہ تھے جن کی موت پر دنیا روئی۔ ایک تم ہو جس کی زندگی کا کوئی خواہش مند نہیں! پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ تم اپنی غلطی پر نادم، غفلت پر پشیمان، مظالم پر متاسف، اور گناہوں پہ پریشان ہو۔ لیکن منزل مقصود پر پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا وہ درست نہیں، تم نے دنیا میں پچاس برس رہ کر بھی خدا کو نہ پہچانا اور یہ اب تک پتہ نہ چلا کہ اس سے ملنے کا طریقہ کیا ہے۔ کلام الٰہی تم نے پڑھا حدیث رسول صلعم تم نے سنی اور آج تک کوری کی کوری رہیں، تم ڈھونڈھتی ہو نماز روزوں میں اور وہ ملتا ہے ناتوان دلوں میں! تم دیکھتی ہو، عبادت و ریاضت میں اور وہ رہتا ہے کمزور سینوں میں! الٹا نہ سمجھنا، میں یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو اور روزہ نہ رکھو۔ اس سے انکار کون کمبخت مسلمان کر سکتا ہے۔ مگر یہ فرائض ہیں۔ ان کی ادائیگی، احسان کیسا اور کمال کس کا۔ کرو تو احسان نہیں، نہ کرو تو حیوان ہو۔ تم نے کہاں سے سیکھا کس نے بتایا خدا اس طرح ملتا ہے؟ بتلانے والا جھوٹا، سمجھانے والا غلط اور کہنے والا بیوقوف۔ تم کو معلوم ہو گا اور نہ ہو تو اب ہو جائے گا کہ اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں، دنیا کو چھوڑ کر تعلقات توڑ کر جنگل میں بیٹھ کر، خانقاہ میں رہ کر، عبادت کی تو کیا کی، ضرورت یہ ہے، لطف یہ ہے کمال یہ ہے کہ زندگی میں دھنس کر، تعلقات میں پھنس کر، قدرت کا منشا پورا کریں، اور پتہ لگائیں موت کا زندگی سے، آخرت کا دنیا سے اور خالق کا مخلوق سے۔ یہی دنیاوی تعلقات جن کو چھوڑ چھاڑ جانماز پر بیٹھیں اور تلاوت شروع کی، خدا تک پہنچانے والے ہیں ؟ توجہ کرو تعلقات پر اور درست کرو معاملات کو، کامیابی کا راز اس میں، خدا کی رضامندی اس میں، عاقبت کی بہار اس میں، تمہارے شوہر عارف سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے اس کو بچہ سا دیکھا تھا مگر

پوت کے پاؤں پالنے میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ بچپن جوانی کی تمہید ہے اور جوانی بڑھاپے کا پیش خیمہ۔ وہ اس وقت بھی ہونہار اور نیک تھا اور اب بھی جہاں تک میں نے سنا اس کی غلطی نہ قصور غفلت نہ خطا۔ وہ مرد ہے اور شوہر ہے۔ تم عورت ہو اور بیوی ہو۔ اس کا درجہ بلند، تمہارے اختیار محدود۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ خدا اور تم لونڈی۔ مگر ہاں یہ کہتا ہوں کہ خدا اور رسولؐ کے بعد وہ تمہارا اور تم اس کی، تمھاری دنیا اس سے، تمھارا دین اس سے، اس نے دوسرا نکاح کیا۔ اس کی ذمہ دار تم اور فقط تم۔ اس سے انکار گناہ اور اس میں بحث ہٹ دھرمی کہ نکاح ثانی کی تمام ذمہ داری بیوی پر ہے۔ بیوی کا کام تھا، اس کا فرض تھا کہ وہ اس ضرورت سے شوہر کو مستغنی کر دیتی اور دل میں ایسا گھر کرتی کہ اس کا گھر نمونہ جنت اور وہ خود زمینی حور بنتی۔ تندرستی میں بہترین رفیق۔ بیماری میں بے مثل تیماردار، تمول میں دیانت دار، افلاس میں عاشق زار۔ المختصر بھلا دیتی اس کے دل سے ماں باپ کو، بہن کو بھائی کو۔ اس کے دُکھ پر سکھ قربان کرتی اور اس کی اذیت پر اپنی راحت نثار۔ کیا تم یا کوئی بیوی کہہ سکتی ہے کہ ایسی بیوی کا شوہر نکاح ثانی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنے اغماض میں رہیں، غفلت کی اور تمکنت برتی اُلٹا سمجھیں اور غلط کیا۔ سفید کو سیاہ سمجھا اور اچھے کو بُرا جانا، کیا تمھاری رائے میں حسن صورت ہی مرد کا دل فتح کر سکتا ہے۔ ہر گز نہیں۔ اس کے ساتھ کچھ اور بھی ضروری ہے۔ محبت ہو خدمت ہو، عنایت ہو، شرافت ہو۔ یہ نہ ہو تو کچھ نہیں۔ دنیا بھی گئی اور دین بھی۔ میں اس حشر سے بھی آگاہ ہوں، جو تمہارے ہاتھوں مرحوم شوہر کی امانت اسلام اور سلیم دونوں بچوں کا ہوا۔ میں اس سلوک سے باخبر ہوں جو عارف کی منکوحہ بیوی نسترن کے ساتھ تم نے کیا اس کے سوا کیا کہوں کہ پھٹ جاتی زمین اور سما جاتیں تم۔ اس سے پہلے کہ میں آتا اور تمھاری صورت دیکھتا۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور جو ہوا اچھا ہوا، غنیمت ہے کہ بھٹک بھٹکا اور بگڑ بگڑا سر پھوڑ اور ٹھوکریں کھا، تم اب بھی راہ راست پر آئیں اور شیطان کے پھندے سے نکل کر، تم نے گناہوں پر توجہ کی اور ندامت کا اظہار کیا۔ معافی کی طالب ہوئیں

اچھا کیا اور خوب کیا۔ مگر یہ تو سوچو جن کے کلیجے دکھتے ہیں، جن کے دل زخمی ہیں، جن کے سینے چھلنی ہیں۔ ان کا علاج کیا کیا؟ جاؤ ان کے قدموں میں گرو۔ جن کے دلوں نے آہ کی ہے۔ ان سے دعا لو اور گھر کی گھر والی بنو۔ بچوں کی موت پر صبر۔ اپنی بربادی پر شکر اور موجودہ حالت پر قناعت کرو۔ شوہر کے حقوق پہچانو۔ عزیزوں کے تعلقات سمجھو اور لونڈی بن کر گھر کی ملکہ بنو۔

وسیم دلہن! خوش نصیب ہو کہ تلافی کا وقت اور معافی کی گنجائش ہے۔ خدا کی تلاش ہے تو تعلقات کی کسوٹی پر پوری اترکر ان بدنصیب ہستیوں کو جو اپاہج ہیں اور زخمی ہیں لنگڑے ہیں اور لولے ہیں سر پر بٹھاؤ اور آنکھوں میں جگہ دو۔ یہ میلی کچیلی صورتیں اور یہ پھٹے پرانے کپڑے خدائی کے خزانے ہیں۔ خدا ان دلوں میں ہے اور عافیت ان کی دعاؤں میں! چوبیس گھنٹہ کی جانماز چھوڑ دو اور دن رات کی تسبیح توڑ دو۔ منزل پر پہنچنا ہے تو یہ ہے سیدھی سڑک اور رستہ صاف، نماز کا وقت آگیا۔ میں اب جاتا ہوں اور اتنا کہہ جاتا ہوں کہ پہچانو سب سے پہلے فرائض، ادا کرو سب سے مقدم حقوق ــــ وسیم دلہن! اگر اس معاملہ میں پوری اتریں تو بیڑا پار، خدا راضی اور رسولؐ خوش۔"

(۱۴)

برسات کے دنوں میں رات کے وقت فاطمہ تن تنہا اپنے گھر میں خاموش بیٹھی تھی ہوا ٹھنڈی تھی اور آسمان ابر آلود، بادل بھی تھا اور بجلی بھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوئی فاطمہ صحن سے اٹھ کر سائبان کے نیچے آئی اور کہنے لگی "کیسی اندھیری رات اور کالی گھٹا ہے خدا اپنی قدرت دکھا رہا ہے کہ میں تن تنہا اس گھر میں زندگی گزار رہی ہوں۔ دنیا کو اگر آدمی غور سے دیکھے تو عجیب کتاب ہے جس کا ہر صفحہ اور ہر سطر انواع و اقسام کی داستان سے لبریز ہے۔ میں وہی ہوں کہ گھر میں علاوہ گھر والوں کے نوکر چاکروں، لونڈیوں کے شور وغل سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ آج کوئی اتنا نہیں کہ میری بے کسی پر دو آنسو گرائے

مگر ہائے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں خدانخواستہ بے کس کیوں ہونے لگی۔ میرا وارث موجود ہے میں کیا کہہ رہی تھی۔ اے ہے کہیں خدا کو بری نہ لگ جائے۔ توبہ اللہ توبہ۔ احسان کی عمر دراز ہو وہ زندہ رہے۔ خوش رہے۔ اس کا کیا قصور۔ مجبور ہے۔ ماں باپ کے قبضہ میں ہے۔ ان کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ اس کے دل میں میری محبت مجھ سے زیادہ ہے۔ مگر حالات نے اس کو بالکل بے اختیار کر رکھا ہے کہ اس کو میری تنہائی کا علم نہیں۔ ورنہ ضرور کچھ نہ کچھ انتظام کرتا۔ مرد ہے۔ اس قسم کی تکلیفیں خود کبھی نہیں اٹھائیں محسوس نہیں کر سکتا۔ رہا داغ کا معاملہ حق یہ ہے کہ دو چار دفعہ نہیں ہزار دفعہ اماں جان نے کھلم کھلا انکار کیا۔ بھلا ایسی صورت اور ایسی حالت میں کس کو غرض پڑی تھی کہ مجھ بدصورت مفلس یتیم کے واسطے خوشامدیں کرتا۔ نکاح تو ہو ہی چکا ہے ٹوٹتا نہیں۔ راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی۔ جو کچھ بھی ہوں بری یا بھلی۔ ہوں اسی کی بیوی۔ کہلاؤں گی تو ان ہی کی۔ اور اگر سچ پوچھو تو مجھے اب اس خواہش کا بھی حق نہیں کہ احسان مجھ کو بیوی سمجھے ماشاءاللہ اس کی عمر ہے۔ جوانی ہے۔ حسین ہے۔ مجھ جیسی بیویاں اس کی جوتی سے لگی پڑی ہیں۔ کس کو اپنی جان دوبھر ہے کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ مرض بھی ایسا پیچھے لگا کہ کوئی بات کرنے کا روادار نہیں۔ کہنے کو تو موت اور زندگی خدا کے کھیل ہیں۔ مگر اماں جان کی موت محض میری وجہ سے آئی۔ وہ بیماری نہیں میرے سبب سے گرفتار ہوئیں۔ مرنے سے تین دن پہلے تمام بدن لال ہو گیا نہ جانے فساد خون تھا یا کچھ اور۔ میں نے ہر چند ان کو منع کیا کہ میرے کھانے پینے کے برتن الگ رہنے سہنے کا کمرہ جدا کر دو۔ میری صورت نہ دیکھو۔ میرے پاس نہ پھٹکو۔ مگر ایک گھر میں کیسے ممکن تھا۔ اور پھر ماں کی مامتا بھلا کس طرح انتظام ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قربان ہو گئیں۔ وہ تو خیر ماں تھیں، مامتا تھی۔ دوسرے کی جوتی کو کیا غرض پڑی کہ مصیبت میں پڑے۔ احسان کو بیویوں کی کیا کمی، مجھ سے ہزار درجہ بہتر صورت شکل والی۔ روپیہ پیسہ والی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا حق ہے

احسان انسان ہے۔ آخر وجہ کیا ہے کہ وہ میری وجہ سے مصیبت میں پڑے اور اپنی جان گنوائے؟ انسانیت کے معنے تو یہ ہیں کہ میں خود اس سے طلاق کی درخواست کردں اور اس کو نکاح کی قید سے آزاد کردوں۔ کوئی معقول عورت کوئی سمجھدار بیوی کوئی ذی ہوش لڑکی ہرگز روا نہ رکھے گی کہ اپنی وجہ سے انسان کو۔ انسان بھی غیر نہیں عزیز۔ عزیز بھی معمولی نہیں شوہر۔ دنیا سے بے کار کر کے موت کے گھاٹ اتار دے۔ میں اگر طلاق کی خواہش کردں تو انسانیت کا فرض ہے کیسی صریح غلطی اور ہٹ دھرمی تھی کہ میں نے طلاق سے بچنے کی خواہش کی اور اس نفسانیت کا پیام اس تک پہنچوادیا۔ اس کا فرض ہے کہ نکاح میں رکھے تو میرے بار کا ذمہ دار ہو۔ آخر مجھے حق کیا ہے۔ میں لنگڑی نہیں، لولی نہیں، اپاہج نہیں، محتاج نہیں، خیرات مجھے نہیں پہنچتی۔ بھیک کا مجھے حق نہیں۔ صدقہ کی میں مستحق نہیں، میری مدد یقیناً غلطی۔ افسوس میری حالت پر اس تھوڑی سی عمر میں کیسی زبردست اور فاش غلطیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ میں انسان نہیں حیوان اور آدمی نہیں جانور ہوں۔

لاریب احسان نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ دنیا اس کا نام سر آنکھوں پر رکھے گی اور میں نے وہ خود غرضی کی کہ ہر متنفس مجھ پر لعنت بھیجے گا۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں خود احسان سے طلاق کی درخواست کردں۔ مگر کیوں کر؟ وہ مجھ تک آ نہیں سکتا میں اس تک جا نہیں سکتی اور وہ آئے بھی اور میں بھی جاؤں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ بیماری اس کو بھی ہو جائے گی۔ پھر اس کا آنا اور میرا جانا حماقت۔ مجھے تو چچی جان کی طرف سے اندیشہ تھا کہ وہ بیماری میں آکر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ زندہ رہیں ورنہ بے چاری قبر تو جھانک ہی آئی تھیں خدا خدا کر کے بچی ہیں۔ کوئی آدمی نہیں کہ اس کے ہاتھ لکھ کر بھیجوں۔ بڑے میاں کا میں تو احسان ہی کہوں گی کہ سودا سلف۔ سوداگر کے ہاں کا مال لا تو دیتے ہیں۔ میں تنخواہ دیتی ہوں تو کیا اور زیادہ دیتی ہوں تو کیا وہ اگر نوکری چھوڑ دیں تو بالکل ہی ہاتھ کٹ جائیں۔ سلائی کا کام دام لکھے کا دکھارہ جلے ان ہی کے ہاتھ پرچہ بھیجوں

یہ تو صحیح کہ مسلمان کو موت کی آرزو جائز نہیں لیکن مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا حق کیا ہے۔ میں کسی کے واسطے مفید نہیں ہو سکتی۔ البتہ زندہ رہی تو نہ معلوم میری وجہ سے کس قدر خدا کے بندے بیمار ہوں گے اور کتنے مریں گے۔ میں لاکھ احتیاط کرتی ہوں کہ کہیں میری بیماری ان کو نہ لگ جائے۔ کوڑھی دنیا میں اور بھی ہیں۔ خدا جانے یہ کس قسم کی کوڑھ ہے جو اڑ کر لگتی ہے۔ اگر کسی روز ہوا ادھر کی ہوئی اور بھنگن بہشتی کو لگ گئی تو یہ عذاب کس کے نامۂ اعمال میں ہوا۔ میرے یقیناً میرے! جس روز سے بیمار ہوئی آج تک اپنے کپڑے اپنے ہی ہاتھ سے دھو رہی ہوں۔ اسی وجہ سے کہ میرے کپڑوں کو ہاتھ لگا کر دھوبن کا بیمار ہونا لازمی ہے۔ مگر کہاں تک یہ احتیاط ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ میری زندگی دنیا کے واسطے مفید ہے۔

گناہ نہ ہو تو مجھے خودکشی میں عذر نہیں۔ مگر اب خواہش ہے۔ مجھے خواہش کا حق نہ ہو۔ لیکن سرشت میری بھی انسانی ہے۔ صورت بگڑ گئی، تو سرشت موجود ہے۔ ایک دفعہ احسان کی صورت دیکھ لوں، مجھے اس کی صورت دیکھے عرصہ ہو گیا، وہ اب ماشاءاللہ جوان ہو گیا، اس کی شکل و صورت، قد و قامت، خدا اس کی عمر دراز کرے خوب نکلا ہو گا۔ لیکن کیا یہ میری خواہش جائز ہے؟ اپنی آرزو پوری کرنے میں اس کی زندگی کا خیال نہ کروں وہ بیمار پڑ جائے۔ میرے منہ میں خاک کوڑھ میں گرفتار ہو۔ مگر اس کی صورت دیکھ لوں۔ توبہ توبہ ہرگز نہیں۔ ہاں دور سے، اتنی دور سے کہ میری ہوا اس تک نہ پہنچے میں اسے دیکھ لوں مگر کیسی خود غرضی ہے کہ میں اس خواہش کا اس پر اظہار کر دوں۔ وہ دھوکہ میں آ جائے اور بیمار پڑ جائے۔ نہیں، نہیں ہرگز نہیں، وہ خوش رہے، تندرست رہے، مجھ کو قدرت نے شکل و صورت صحت و تندرستی کی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ میری انسانیت، اب صرف یہی ہے کہ میں اپنی بے سود ہستی کے تخیل سے اس کے دماغ کو پاک کر دوں۔ یہ ممکن نہیں کہ احسان مجھے بھولا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کے خیالات رنگ برنگ کے پھولوں کی طرح اس کے دلوں کو معطر کر رہے

ہوں گے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ میرا وجود ان پھولوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہوگا۔ کیا یہ مشکل تھا کہ احسان آکر مجھے طلاق دے دیتا۔ دو لمحے کی محنت۔ دو قدم کی زحمت اور چٹکی بجانے کا کام تھا! باوجود اختیار کامل کے، اس کی خموشی، خموشی نہیں کرم ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی خیال اس وقت تک طلاق کو روکے ہوئے ہے اور وہ کیا ہے۔ صرف میری محبت۔ لاریب اس کا کام یہی تھا۔ بھلوں کی بھلی باتیں افسوس مجھ پر ہے کہ کیسی لاپروائی سے وقت ٹالا۔ معاملہ کو ختم نہ کیا۔

کیسا دھونتال پانی پڑ رہا ہے! تین گھنٹے سے زیادہ ہوگئے۔ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اٹھوں پرچہ لکھوں۔ احسان سے درخواست کروں کہ مجھ کو طلاق دے، اس لئے کہ اب میرا وجود اس کے واسطے مفید نہیں مصیبت ہے۔ ہاں ایک اور التجا کروں، وہ اگر پسند کرے تو مہینہ میں، سال میں، کبھی کبھار ایک دفعہ دور سے مجھے اپنی صورت دکھا دیا کرے۔ لیکن نہیں۔ نہیں کیوں؟ کیا سبب؟ کیا وجہ؟ بس بس اپنی نفسانیت ختم کردوں۔ وہ ملکیت ہوگا۔ اس بیوی کی۔ جو اس نکاح کی مستحق ہو۔ وہ شوہر ہوگا اس عورت کا جو اس قابل ہو۔ مگر میرا یہ آخری پرچہ ہوگا۔ اس کے بعد مجھے کوئی حق نہیں کہ میں احسان کو پرچہ لکھوں۔ یہ میری آخری درخواست ہوگی۔ جو تمام تعلقات کو ختم کرتی ہے احسان مجھ سے چھوٹتا ہے اچھا۔"

اب فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اسی حالت میں قلم دوات لے کر بیٹھی اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ دل امنڈا آرہا تھا۔ آنسو کے قطرے ٹپ ٹپ کاغذ پر گر رہے تھے روتی تھی۔ آنسو پونچھتی تھی۔ سنبھلتی اور پھر لکھنے لگتی تھی۔ لکھتے لکھتے دفعتاً دماغ نے کروٹ لی۔ خیالات نے پلٹا کھایا اور ایک عجیب تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ چونک پڑی اور کہنے لگی۔ یادش بخیر میری پیاری ثریا کیسی چھوٹی۔ صورت دیکھے تین مہینے سے زیادہ ہوگئے اس مرض کمبخت کی بدولت کیسی کیسی پیاری صورتیں ہمیشہ ہمیشہ کو بچھڑ گئیں۔

ثریا کا خیال آتے ہی کیسے کیسے منظر یاد آ گئے۔ احسان، ثریا ایک ہی جگہ چھوٹے سے بڑے ہوئے۔ کیسی ملنسار لڑکی ہے۔ میرے نام کی عاشق۔ دنوں اور راتوں ہم تینوں پاس رہے اور ساتھ کھیلے۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ ایک شہر کے شہر میں مہینوں گزر جائیں اور ملنا نصیب نہ ہو۔ ثریا غریب کی کیا خطا۔ میری تقدیر کا قصور ہے۔ وہ تو اب بھی کسی طرح باہر نہیں۔ میں نے ہی منع کر دیا۔ امیر کی بچی لاڈلی۔ اللہ آمین والی۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی نگاہ میں فرق نہیں۔ اس روز بھی تو کہلا بھیجا ہے کہ تڑپ رہی ہوں۔ میں تو اب کسی قابل رہی نہیں۔ بس ان سب کی طرف سے تو میں مر گئی۔ ان کی پیاری صورتوں کے بدلے اب ان کی یاد کے میرے کلیجے پر داغ باقی ہیں۔"

اتنا کہہ کر فاطمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ادھر ادھر ٹہلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ثریا کے فراق میں اس کا کلیجہ اس وقت منہ کو آ رہا ہے۔ ٹھنڈے سانس بھرتی تھی اور آنسو کی لڑیاں چہرہ پر بہہ رہی تھیں۔ کوٹھڑی میں گئی صندوقچہ کھولا اور ایک تصویر نکال کر لائی جس میں تینوں گھاس پر بیٹھے پھولوں سے کھیل رہے تھے۔ تڑپ اٹھی تصویر کو پیار کیا اور سینے سے لگا کر رونے لگی۔

فاطمہ کی بد نصیب آنکھوں کی طرح آسمان کی لڑی بدستور لگی ہوئی تھی وہ اپنے خیالات میں اس قدر منہمک تھی کہ مینہ دھواں دھار پڑا۔ بجلی زور سے چمکی۔ بادل شدت سے کڑکا۔ مگر اس کو مطلق خبر نہ ہوئی کہ آسمان پر کیا ہوا اور زمین پر کیا ہو رہا ہے۔ رات کا بڑا حصہ گزر گیا۔ دوپہر اسی ادھیڑ بن میں ختم ہو گئی مگر اس کا اضطراب ختم نہ ہوا۔ چاروں طرف تڑپ رہی تھی کہ اس نے دروازے پہ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنی۔ حیران ہوئی۔ متعجب ہوئی، پریشان ہوئی۔ چند لمحہ خاموش رہی، اور اس کے بعد ڈیوڑھی میں آ کر پوچھا:۔ "کون ہے؟"

"کنڈی کھولو"

فاطمہ۔ "یہ کون؟"

آواز "کیا آواز بھی بھول گئی؟"

فاطمہ "اس آواز کے قربان ثریا اس وقت کہاں ؟"
ثریا۔ "کنڈی کھولو، میں بھیگ رہی ہوں"
فاطمہ۔ "میں کنڈی کھول دیتی ہوں مگر دو منٹ کے بعد اندر داخل ہونا"
ثریا۔ "اچھا کھولو۔"

فاطمہ کنڈی کھول کر اندر آئی۔ کوٹھری میں چلی گئی۔ دروازہ ذرا سا کھلا رکھا ثریا اندر آئی۔ چاروں طرف دیکھا اور گھبرا کر کہا "ہائیں پیاری فاطمہ کدھر گئی۔؟"

فاطمہ: "تم وہیں رہو، میرے پاس نہ آؤ۔ کہو اس وقت کیسے آئیں، خیر تو ہے ؟"
ثریا۔ "خدا کا شکر ہے۔ خیر صلاح۔ آنے کا ارادہ کئی دن سے کر رہی تھی۔ تم نے یہ غضب کیا کہ آمدورفت بھی بند کر دی۔ آؤ نہ بلاؤ۔ بیمار ہوتے ہیں تو کیا ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں ؟"

فاطمہ: "بیماری، بیماری میں بھی تو فرق ہے۔ مرض، مرض بھی متعدی کہ ہوا سے بچو، اڑ کر لگنے والا۔ اس میں بھی اگر میں احتیاط نہ کروں تو مجھ سے زیادہ ناہنجار ہستی اور خود غرض انسان دنیا میں کوئی نہ ہوگا"

ثریا۔ "فاطمہ دیوانی ہوئی ہے۔ ایسی ایسی احتیاطیں کریں۔ تو دنیا میں رہ چکے۔ چل باہر آ"

فاطمہ "نہیں ثریا ضد نہ کرو اور نقصان نہ اٹھاؤ۔ احتیاط لازمی اور ضروری ہے۔ محبت کا جو جذبہ اس وقت تیرے دل میں موجود ہے۔ اس سے میں بھی محروم نہیں۔ مگر کیا یہ میری انسانیت ہوگی کہ اپنے لغو جذبات پر تیری بیش بہا زندگی قربان کر دوں۔ میں دنیا میں رہنے کی خواہش مند کب ہوں۔ میری زندگی ختم ہوگئی۔ اور اب میری کامیابی صرف یہی ہے کہ میں اپنی زندگی سے کسی دوسرے کی زندگی برباد نہ کروں"

ثریا۔ "اور اگر میں نے ڈاکٹر سے اطمینان کر لیا ہو ؟"
فاطمہ۔ "ثریا خدا تجھ کو خوش رکھے۔ یہ سب میرے دل رکھنے کی باتیں ہیں۔ میری پیاری

ثریا تو دنیا میں خوش رہ۔ میری دلی آرزو ہے کہ دنیا کی خوشی تجھ کو میسر ہو۔ یہ ضرور ہے کہ میری زندہ صورت تجھ جیسی عزیز سہیلی کو اکثر مضطرب کرے گی۔ مگر میری جان ثریا دنیا اسی کا نام ہے۔ موت نے بہت سے عزیز جدا کر دیئے، کیسے کیسے، جن کے فراق کا خیال دل کو تڑپا دیتا تھا۔ اب وہ کہاں ہیں؟ صرف ان کی یاد باقی ہے، اسی طرح تو مجھ کو بھی صبر کر اور جس طرح میں تیرا خیال آخر وقت تک اپنے سینے سے چمٹائے رہوں گی اسی طرح تو بھی فاطمہ کا خاتمہ سمجھ اور اس کی یاد سے دل شاد رکھ"

جس وقت فاطمہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ثریا کوٹھری کے اندر گھسی اور گلے سے لپٹ کر کہنے لگی:۔

"قربان! کیسی زندگی اور صحت۔ پیاری دونوں تجھ پر صدقے!"

اب فاطمہ کا دل اور بگڑا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ثریا کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور وہ اس وقت جذبات سے اس قدر مغلوب اور ثریا کی محبت سے اس درجہ متاثر تھی کہ اپنی بیماری اور مرض متعدی کو قطعاً بھول گئی اور ثریا سے چمٹ کر اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ تریب قریب آدھ گھنٹہ تک یہی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد فاطمہ کو اپنی حالت کا ہوش آیا۔ وہ چونکی اور چونک کر پیچھے ہٹی اور کہا۔

"ہے ہے پیاری ثریا تو نے کیا غضب کیا۔ مجھ سے لپٹ گئی! اللہ تجھ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے"

ثریا۔ "میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ڈاکٹر سے میں نے دریافت کیا، جس نے یہ رائے دی تھی، وہی اب اپنی غلطی کا معترف ہے"

فاطمہ "ثریا تو جیئے، تیری عمر دراز ہو، تو میرا دل رکھ رہی ہے، مجھے تجھ سے یہی امید ہے مگر میں سب سمجھتی ہوں۔ تو نے غلطی کی۔ مگر یہ تو بتا یہ اس وقت پانی میں اندھیری رات میں کیسے آئی، کیوں کر آئی؟ کہاں سے آئی؟"

ثریا۔ "بات یہ ہے کہ کل کی یہاں تمہارے پڑوس میں آئی ہوں، ہمانی جان کا سمدھیانہ ہے

وہ اصرار سے ساتھ لے آئیں۔ لڑکی کی شادی تھی۔ قصد تو شام ہی سے تھا۔ مگر مجبور یوں ہو گئی کہ اس ڈھونتال پانی نے کہیں کا نہ رکھا۔ اب برات آئی ہے تو چھٹکارا ملا "

فاطمہ "اب تو تین بج رہے ہیں "

ثریا۔ " ہاں، دس منٹ باقی ہیں۔ ساری رات اکارت گئی "

فاطمہ۔ " میری ثریا تو ایک کام کر "

ثریا۔ " کیا ؟"

فاطمہ۔ " قسم کھا انکار نہ کروں گی ؟ "

ثریا " اے ہے فاطمہ کیا ہو گیا۔ بھلا جھوٹ بھی کس سے کہوں گی۔ تجھ سے قسم کی کیا ضرورت ہے۔ یقین کر جان تک تجھ سے زیادہ عزیز نہیں، کہہ کیا کہتی ہے ؟ "

فاطمہ " یہ سامنے پردے کے پیچھے غسل خانہ میں چلی جا اور کنجیاں لے۔ سامنے والے بڑے صندوق میں چھوٹی صندوقچی رکھی ہے اس میں ایک ڈبیا میں سفوف ہے۔ وہ پانی میں ڈال کر پی لے۔ یہ احتیاطاً میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ اگر اتفاق سے میری ہوا کسی کو لگ جائے تو فوراً نہلوا دوں "

ثریا۔ " توبہ توبہ! فاطمہ کیا لغو باتیں کرتی ہے "

فاطمہ۔ " ثریا اس میں بحث نہ کر۔ اسی واسطے کہا تھا قسم کھا لے "

ثریا۔ " اچھا نہا لوں گی۔ کیوں احسان کا بھی کوئی رقعہ پرچہ آتا ہے۔ کیا طوطا چشم آدمی نکلا "

فاطمہ " کیوں کیا کیا؟ تم نے اس کی کوئی نامعقول بات سنی ؟ "

ثریا۔ " میں کیا سنتی، مجھے تو اس کی صورت دیکھے برسوں ہو گئے۔ میرا اس کا کیا واسطہ! اور میں کیوں سنتی؟ تمہارے ساتھ اس نے جو کچھ کیا وہ دنیا دیکھ رہی ہے "

فاطمہ " ثریا کیا الٹی الٹی باتیں کر رہی ہے۔ کیا جوان ہو کر بچپن کی محبت کو ٹھکرانا

شرافت ہے۔ کیا حسین منزل کے وہ اونچے اونچے ٹیلے جن کی آغوش میں آج تک ہمارے معصوم جذبات دفن ہیں۔ تیری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتے؟ میرے احاطہ کا پیپل والا درخت جس کی ہری بھری ٹہنیاں کبھی کھڑ کھڑ ہوئیں اور کبھی سرسبز، جن کی گود میں ہم تینوں نے جھولا جھولا، ہمارا ہمراز نہیں؟ بارہ دری کی خاک جس پر لوٹ پیٹ کر ہم سیانے ہوئے جس نے ماں کی طرح ہم کو لوریاں دے کر سینہ سے چمٹایا۔ کیا تیری رلائے میں ہماری بے لوث محبت کا دفتر نہیں؟ احسان جس نے مٹی کے گھر بنانے میں بارہا ہم کو پانی اور گارا لا کر دیا۔ جس نے چار سال تک ہمارے ساتھ دن رات آنکھ مچولی کھیلی جو بچپن کی ہر کوشش میں ہمارے ساتھ برابر کا شریک رہا۔ جس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر ہم درختوں پر چڑھتے تھے۔ ثریا کیا اسی قابل ہے کہ تو اس کے نام پر اس طرح تیوری چڑھائے؟"

ثریا۔ "وہ محسن کش احسان جس نے تجھ جیسی ہیرا بیوی کو دغا دی، انسان نہیں جانور ہے"

فاطمہ۔ "پیاری ثریا میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کا واسطہ میرے زخمی دل پر نمک نہ چھڑک ثریا للہ احسان کو برا نہ کہہ۔ اس نے مجھ کو ہرگز دغا نہ دی، اس نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی"

ثریا۔ "میں سچی ہوں، معاملہ سے واقف اور راز سے باخبر، تو حال سے بے خبر اور مآل سے ناآشنا۔ اس پر لعنت بھیج اور اس کمبخت کا نام نہ لے، تجھ کو معلوم ہے کہ وہ دوسرا نکاح کر رہا ہے۔

فاطمہ۔ تو اس کو میرے سامنے برا نہ کہہ"

ثریا۔ "نادان تو دیوانی ہے، سنا بھی میں کیا کہہ رہی ہوں۔ وہ نکاح کر رہا ہے"

فاطمہ۔ "اس نے غلطی کی کہ اب تک نہ کیا۔ اس کو کر لینا چاہیے تھا"

ثریا۔ "کیوں؟"

فاطمہ۔ "اس لئے کہ میں بیوی بننے کے قابل نہیں جس بدنصیب کی صورت سے آدمی اور جانور تک پناہ مانگیں، اس کا شوہر اور نکاح نہ کرے تو کیا کرے"

ثریا۔ "یہ تیرا خیال غلط ہے۔ میں نے تجھ کو دکھا دیا کہ میں اچھی ہوں۔ ہوا کا گزر ہے نہ مرض نہ مرض کا اثر۔ پھر کیا وجہ ہے کہ احسان دغا کرے؟"

فاطمہ۔ "خدا کا واسطہ تو احسان کے فعل کو دغا نہ کہہ۔ اگر تو محفوظ رہی اور رہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں پاک اور صاف ہوں۔ اور بالفرض یوں بھی صحیح تو اب میری شکل وصورت یقیناً اس قابل نہیں کہ احسان مجھ کو اپنی بیوی بنا سکے"

ثریا۔ "فاطمہ تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔ ایسا خود غرض، ایسا مکار انسان تعریف تو در کنار نام لینے کے قابل نہیں۔ اچھا وہ زیور کا کیا حشر ہوا؟"

فاطمہ۔ "مجھے اس سے پہلے اس کا خیال بھی نہ آیا"

ثریا۔ "کچھ زیور اس کے ہاں کا تمہارے پاس تھا اور یہاں کا ادھر"

فاطمہ۔ "ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔ اور ایک ہار میرے پاس موجود بھی ہے۔ یہ ادھر ہی کا ہے اور میرے نکاح کی یادگار ہے۔ جس کو دیکھ کر میں پچھلا زمانہ یاد کر لیتی ہوں"

ثریا۔ "تو اس کو احتیاط سے رکھو"

فاطمہ۔ "ہاں احتیاط سے رکھا ہے"

ثریا۔ "تم کیا خاک احتیاط کرو گی"

فاطمہ۔ "قفل میں رکھا ہوا ہے، اس صندوقچی میں جس میں دوا ہے"

ثریا۔ "تو کنجیاں لا دو۔ میں نہا لوں"

فاطمہ "ہاں یہ لو۔ مگر ابھی نہ اٹھانا۔ میرا ہاتھ لگا ہوا ہے۔ ذرا اس کی ہوا نکل جائے"

ثریا۔ "واری نیک بخت تو بھی غضب کی دشمن ہے"

فاطمہ۔ "مگر ہاں پانی تو گرم ہے نہیں۔ دیکھو میرا پانی تو یہ الگ رکھا ہوا ہے، اور باقی

یہ دو مٹکے بھرے رکھے ہیں۔ ان کو میں ہاتھ نہیں لگاتی اور دیں برتن بھی ہیں۔ میرے برتن ادھر ہیں۔ ان کو نہ چھونا۔"

ثریا۔ "توبہ توبہ فاطمہ کیا باتیں کر رہی ہو؟"

فاطمہ۔ "خدا ہی نے یہ باتیں کروا دیں۔ میں کیا کر رہی ہوں۔ تو پانی گرم کرلے"۔

ثریا "نہیں نہیں، ایسی کون سی سردی پڑ رہی ہے۔ پانی بند ہوتے ہی دیکھو کیا گرمی ہوتی ہے۔ برسے گا"۔

ثریا کنجیاں لے کر صندوق کے پاس گئی۔ صندوقچی نکالی۔ غسل خانے میں آئی، نہائی کپڑے پہنے اور کہنے لگی:۔ "فاطمہ! اللہ بیلی۔ اللہ نگہبان۔ صبح ہو رہی ہے۔ اندھیرے اندھیرے میں چلی جاؤں"۔

فاطمہ۔ "اچھا فی امان اللہ"۔

ثریا۔ "کیا بتاؤں، ابھی نیت تو نہیں بھری ہے اتنے دنوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی گھڑی آدھ گھڑی کو۔ تو نے مجبور کر دیا، نہیں تو ایک دفعہ اور گلے ملتی"۔

فاطمہ۔ "نہیں نہیں ثریا، نہیں نہیں بس جا تو خوش رہ"۔

ثریا چلی گئی تو فاطمہ پھر اٹھی۔ قلم دوات لے کر بیٹھی۔ اس کی طبیعت اوّل ہی شام سے بگڑ رہی تھی۔ احسان کو پرچہ لکھنے بیٹھی تو حالت اور زیادہ خراب ہوئی۔ ثریا نے آکر اس آگ پر اور تیل ڈالا اور اس کے جانے سے وہ شعلے بھڑکے خط ختم کرنے بیٹھی تو دل کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا۔ ہر چند کوشش کرتی تھی کہ سنبھلوں۔ مگر دل بے اختیار امڈا چلا آرہا تھا۔ نہ لکھ سکی۔ قلم دوات رکھ کر صحن میں نکلی تو اذان کی آواز کان میں آئی۔ وضو کے واسطے لوٹا اٹھایا۔ پانی لینے بڑھ رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا کون ہے؟ جواب نہ ملا تو آگے گئی، پھر پوچھا۔ اب بھی جواب نہ ملا تو دروازہ کے پاس پہنچی، دریافت کیا تو کسی نے کہا:۔

"یہ میاں احسان کا پرچہ ہے۔"

اس نام کے کانوں میں آتے ہی تمام جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، ہاتھ پاؤں میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔

"اچھا دراڑوں میں سے ڈال دو"

آدمی نے پرچہ ڈال دیا اور یہ کہکر چلا گیا کہ "میں دوپہر کو جواب کے واسطے آؤں گا۔"

فاطمہ نے پرچہ اٹھایا اور سوچنے لگی کہ پہلے خط پڑھوں یا نماز؟ اضطراب یہ کہہ رہا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس تحریر کو دل چیر کر اندر رکھ لوں۔ مگر ایمان کی تاکید یہ تھی کہ پہلے اس کا شکریہ ادا کروں جس نے مجھ کو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی۔ چند لمحے اسی کشمکش میں رہی۔ مگر لڑکی تھی، وہ بھی ناتجربہ کار، مصیبت زدہ اور قابل رحم، دل ایمان پر غالب آیا۔ پو پھٹ رہی تھی اور یہ بھی عجیب سہانا وقت تھا۔ آسمان کے روشن چہرہ پر اس وقت سیاہ نقاب تھی اور شہسوار مشرق مشکی توسن پر سوار خراماں خراماں قدم بڑھا رہا تھا۔ فاطمہ کی اشک آلود آنکھیں اوپر اٹھیں۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور خط کو آنکھوں سے لگا کر پتہ پر نظر ڈالی۔ مگر یہاں کچھ نہ تھا۔ لفافہ صاف تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ ان ہی ہاتھوں اور اسی دل سے لفافہ چاک کیا اور پرچہ باہر نکالا تو لکھا تھا:۔

"انسان کی خواہش خدا کی خواہش پر غالب نہیں، میری آرزو تو یہی تھی کہ ہم دونوں جس طرح بچپن میں پیار و محبت کے ساتھ کھیلے کودے، اسی طرح جوانی اور بڑھاپے میں بھی ساتھ رہیں اور مریں۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ بیماری نے تمھاری صورت بگاڑ دی خیر اس کا بھی مضائقہ نہ تھا۔ اب جو مرض تمھارے پیچھے لگا ہے، اس نے تمام چیزوں کا خاتمہ کر دیا۔ گو ڈاکٹر کی رائے سن چکا ہوں کہ وہ مدت ختم ہو گئی۔ اور اب زیادہ اندیشہ کی بات نہیں۔ مگر میری رائے میں ابھی شبہ تو موجود ہی ہے اور ایسی حالت

ہیں جان بوجھ کر کنوئیں میں گرنا بہت مشکل ہے۔ میں اور صبر کر لیتا۔ مگر والدین کے حکم سے مجبور ہوں۔ خرابی آکر یہ پڑی کہ جہاں نکاح کی تجویز ہے، وہاں کی پہلی شرط ہے کہ تم کو طلاق دوں۔ میں تمھاری طبیعت سے واقف اور عادت سے باخبر ہوں اور جانتا ہوں کہ تم کو اس میں عذر نہ ہوگا۔ ہاں ایک ضروری بات اور ہے۔ اماں جان نے جو ہار تم کو چڑھایا تھا وہ یقیناً محفوظ ہوگا۔ وہ چونکہ خاندانی ہے۔ اس لئے تجویز ہے کہ اب ادھر چڑھایا جائے۔ تم اگر اس کو واپس کر دو تو جو خلعت مجھ کو چچا جان نے دیا تھا وہ بھیج دوں۔ یہ ڈیڑھ دو ہزار کا ہے۔ اس وقت تمھاری بہت سی ضرورتیں اس سے رفع ہو سکتی ہیں۔"

احسان

اس پرچہ کو پڑھ کر آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، بہت چاہا کہ سنبھلے۔ مگر نہ سنبھل سکی چکر آیا۔ برابر ستون تھا۔ پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ کام نہ دے سکے۔ ایک "ہائے" کی آواز نکلی اور زمین پر گر پڑی۔

صبح کا سہانا وقت تھا چڑیاں بدنصیب فاطمہ کی حالتِ زار کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ اور روز روشن سرہانے کھڑا قدرت کے کرشمے دیکھ رہا تھا۔ تن تنہا ایک ڈھنڈار گھر میں بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ کوئی اتنا نہ تھا کہ پانی کے دو چھینٹے اس کے منہ پر دے دیتا۔ کہیں آدھ گھنٹہ بعد جا کر ہوش آیا تو قلب کی عجیب کیفیت تھی۔ چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے اور احسان کا پرچہ سامنے! پڑھا اور کہنے لگی:۔

"آج اتنا واسطہ بھی ختم ہوتا ہے، میری صرف ایک آرزو تھی اور وہی پیام بھجوا چکی ہوں کہ جس وقت روح پرواز کرے تو احسان کے نکاح میں ہوں۔ آج وہ آرزو فنا ہوتی ہے احسان میں ہرگز یہ نہیں سمجھتی اور نہ کہتی ہوں کہ تو نے زیادتی کی۔ میں یقیناً اس سلوک کی مستوجب تھی۔ اب مجھ کو صرف ایک تکلیف ہے۔ اس کا کیا علاج ہو؟ طلاق تو شاید بیوی کو سامنے بٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ احسان میرے

سامنے آئے۔ میری ہوا اس کو لگے۔ احسان کا سامنے آنا بے شک اس کی بربادی ہے۔ طلاق اگر بیٹھے بیٹھے ہو سکتی ہے تو وہ لکھ کر بھیج دے۔ یا میں خود لکھ کر بھیج دوں۔ کہ طلاق لے لی۔ خبر نہیں کیا حکم ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ مگر یہ تو نہ ہوگا کہ فاطمہ کم بخت کی ہوا احسان کو لگے۔ نہیں یہ نہ ہوگا۔ ہرگز نہ ہوگا۔ ہار حاضر ہے۔ صرف اتنی بات تھی کہ اس کو دیکھ کر عمر گذشتہ کی وہ ساعت جواب کبھی میسر نہیں آسکتی۔ یاد آجاتی تھی۔ مگر ہاں مجھ کو اس کے رکھنے کا حق کیا ہے۔ یہ اس کی ملکیت ہے اس کا مطالبہ جائز اور خواہش درست۔ اس پرچہ کا جواب لکھدوں ''

اسی طرح الٹی سیدھی باتیں کرتی ہوئی اٹھی۔ قلم دوات لی۔ پرچہ لیا۔ صندوقچی نکالی۔ کھولنے کا ارادہ کرتی تھی کہ ایک دفعہ ہار کو نکال کر دیکھ لوں۔ بوسہ دے لوں اور رخصت کردوں۔ مگر پھر خیال آیا میرا ہاتھ لگ جائے گا۔ یہ ٹھیک نہیں۔ صندوقچی خود کھول کر رکھدوں گی۔ اور آدمی سے کہہ دوں گی الگ سے نکال لے۔ اب ثریا کا ہاتھ لگا ہوا ہے۔ کچھ ہرج نہیں۔

صندوقچی کو اس لئے کہ اس میں احسان کے ہاں کی چیز تھی، بوسہ دیا۔ اور اس طرح کہ آنسو کے قطرے صندوقچی پر گرے۔ اٹھی اور صندوقچی کھول کر دروازہ میں رکھ لکھنے بیٹھی۔ اور لکھا:۔

میرے آقا!

تم مالک میں کنیز۔ ارشاد صحیح اور حکم درست۔ بجاآوری میں عذر نہ تعمیل میں تامل۔ ہار حاضر ہے۔ خدا نصیب کرے! خلعت مبارک رہے۔ دینے والے قبروں میں جا سوئے۔ میں لینے والی کون؟ یہ صحیح کہ میری صورت بگڑ گئی۔ میرا منہ دیکھنے کے قابل اور میں بات کرنے کے لائق نہ رہی۔ طلاق کی سزاوار یقیناً

ہوں۔ مگر سامنے آکر نہ دیجئے۔ ایسا نہ ہو۔ میری ہوا کوئی خراب اثر پیدا کرے۔ اگر تحریری طلاق ممکن ہے تو ہوگئی۔ اچھا احسان خدا حافظ، فی امان اللہ"

پرچہ لکھا اور پڑھا۔ روئی۔ خوب روئی اور پھر سوچا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ احسان کے ہاتھ میں جانا ٹھیک نہیں۔ یہ سوچ رہی تھی کہ آدمی آگیا دروازہ پر گئی اور کہنے لگی۔

"ذرا دوات قلم اور کاغذ لے آؤ" آدمی گیا اور آیا۔ پرچہ زمین پر رکھ دیا کہ نقل کر لو۔ اور صندوقچی لے جاؤ۔ احسان سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ فاطمہ نے خوش رہنے کی دعائیں دی ہیں۔

(۱۵)

کہتے ہیں جس طرح کھوئی ہوئی دولت کا زخم بھی دولت سے بھرا جا سکتا ہے اسی طرح مری ہوئی اولاد کا داغ، دوسرے بچے مٹا دیتے ہیں۔ نہ معلوم یہ خیال کہاں تک درست اور کس حد تک صحیح ہے۔ کیا تعجب ایسا ہی ہو۔ مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ جن بھولے مکھڑوں نے ابدی نیند سو کر کلیجہ بھون دیا۔ ان کے فراق کی تلافی زندگی کی کوئی نعمت نہیں کر سکتی۔ اسلام اور سلیم جیسے ناہنجار بچوں کے بعد جو کنبہ اور خاندان کے واسطے ننگ و عار تھے، اگر وسیم دلہن کے پیٹ سے قسیم اور نسیمہ جیسے بچے بھی پیدا ہو جاتے تو بھی مٹنے والوں کی یاد تادم واپسین زخمی دل سے فراموش نہ ہوتی۔ کہنے کو خدا کا احسان کہہ لو۔ مگر ہم تو یہی قدرت کی ضرورت کہیں گے۔ دنیا خدمت کا معاوضہ ریاضت کا نتیجہ۔ عبادت کا بدلہ شوق سے کہے اور سمجھے کہ مردہ بچوں کی ماں، زندہ بچی کی ماں بنے۔ لیکن موٹی عقل کا آدمی بھی اچھی طرح سمجھ اور

پوری طرح دیکھ سکتا ہے کہ دنیا کا قیام، ضرورت مخلوق کی نہیں خالق کی ہے اور مامتا کا راز اسی سلسلہ میں پوشیدہ اور ضرورت میں مضمر ہے۔ ورنہ یہی کالے کلوٹے، سڑے بساندے بچے جن کی ایک چھینک ماں باپ کے دم پر بنا دیتی ہے اگر پرورش کے واسطے دوسرے ماں باپوں کے سپرد کر دیئے جاتے۔ تو شاید دو چار ہی صدی میں دنیا فنا ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عارف اور نسترن کے اس خیال سے کہ وسیم دلہن کو بڑھاپے میں عارفہ دے کر خدا نے اپنی قدرت دکھائی قطعاً متفق نہیں۔ ہاں وسیم دلہن کی زندگی کا یہ دور ان عورتوں کے واسطے جو بچوں کا وجود مصیبت سمجھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ضرور ایک سبق ہوگا کہ عارفہ کی ہستی نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے۔ پھوٹی ہوئی آنکھیں روشن کیں اور چھوٹے ہوئے ماں باپ ملوا دیئے۔ وعظ کا ہر فقرہ اور تقریر کا ہر حرف وسیم دلہن کے کلیجے میں گڑ رہا تھا۔ چچا نے ہنس ہنس کر کہا۔ اور بھتیجی نے رو رو کر سنا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خدا کی رضامندی نماز روزہ ہی میں نہیں، خدا کے بندوں میں ہے مگر آج اس کو معلوم ہوا کہ شوہر کو ناراض کر کے اگر خانہ کعبہ کے اندر یا روضہ رسولؐ کے پاس بھی مر جائے تو مغفرت ہزاروں کوس دور ہے۔ حقوق پر نظر ڈالی تو سب سے مقدم، سب سے افضل اور سب سے اوّل شوہر تھا اور ناخوش تھا جس طرح عام طور پر خطاوار مشکل ہی سے اپنے تئیں قصوروار سمجھتا ہے، اسی طرح وسیم دلہن چند لمحے تک تو یہی سمجھی کہ قصوروار عارف اور میں بے گناہ! ظالم وہ ہے کہ میرے سینے پر سوکن لا بٹھائی۔ جفا شعار اس کی بیوی ہے کہ ہنس ہنس کر جلایا اور کھل کھل کر رلایا۔ مگر اس لئے اور صرف اس لئے کہ متلاشی حق تھی۔ ایمان کی روشنی میں اپنی زیادتی، عارف کا تحمل۔ سوکن کی انسانیت ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ عارف جس روز بچی ہوئی۔ ہر وقت نہیں، تو دن میں دو تین مرتبہ اس کو دیکھنے

آتا۔ بچی جوں جوں بڑھتی گئی۔ باپ کا دل اس طرف کھنچتا گیا۔ اب تو یہ کیفیت تھی کہ کچہری سے آتا تو سیدھا بڑے گھر میں۔ اور وہ اتنی سی مینا بھی۔ حالاں کہ سات آٹھ مہینے کی جان تھی۔ باپ کی صورت اچھی طرح پہچان گئی۔ اس نے دور سے آواز دی اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے پاس آکر ہاتھ بڑھائے اور یہ کھسک کر ماں کی گود سے نکلی۔ وسیم دلہن اگر پرانی وسیم دلہن ہوتی، تو تعجب نہیں وہ شوہر کی اس محبت کو بھی عداوت ہی سمجھتی، مگر اب اس کے حالات میں۔ خیالات میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ عارف کا دل وسیم دلہن کی طرف سے حق یہ ہے کہ اس درجہ پھٹ چکا تھا کہ اگر وسیم دلہن خدائی کا جامہ پہن کر بھی ایک دفعہ سامنے آتی تو وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ ہرچند اس نے اپنی طرف سے کوشش میں کمی نہ کی۔ اور جہاں تک ممکن ہوا۔ اطاعت اور خدمت میں کسر نہ کی۔ عارفہ کی پیدائش سے ایک ہفتہ پہلے یوں سمجھو کہ پورے نو، پانی کا بھرا ہوا گھڑا صرف اس کے واسطے اوپر سے نیچے لے کر آئی۔ لیکن عارف کو جونک نہ لگی۔ وہ متعجب تھا ششدر تھا۔ مگر ایمان نہ لاتا تھا۔ عارفہ سچ پوچھو تو فرشتۂ رحمت کا کام کر گئی کہ اس نے ماں کے خلوص کا متنفر باپ کو یقین دلایا۔ جب وہ چار ہی مہینوں اور متواتر عارف نے بیوی کی یہ کیفیت دیکھی۔ تو ادھر تو خود اس کی اپنی حالت۔ ادھر وعظ کی خبر اور سب سے زیادہ وسیم دلہن کی اطاعت۔ آخر انسان تھا۔ بیوی کی طرف جھکا۔ پرانی وسیم دلہن تو اس کے جھکنے پر شاید ایسی شیر ہوتی کہ زمین پر پاؤں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ مگر دنیا اس کو کافی سبق دے چکی تھی۔ اس نے شوہر کا ہر قدم سر آنکھوں پر رکھا اور تمام فرائض اس خوبصورتی سے ادا کئے کہ عارف اس کی پچھلی لغزشوں کو بھول گیا۔

جس گھر میں ہر وقت کتے لوٹتے رہے۔ جہاں مہینوں جھاڑو نہ لگتی۔ وہ چھوٹا سا دیوان خانہ تھا۔ اور جو گھر والی ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی رہتی وہ اس وقت خاصی انسان معلوم ہوتی تھی۔ دونوں وقت کا بناؤ سنگار اور کنگھی چوٹی تو نہ تھی۔ اور ہو سکتی بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ عمر ہی ایسی نہ تھی۔ مگر ہاں نفاست جو شرافت کا تقاضہ ہے۔ صورت سے۔ لباس سے، وضع سے قطع سے ظاہر ہو رہی تھی۔ عارفہ کا تو فقط بہانہ تھا۔ اور اس سے انکار نہیں کہ وسیم دلہن کا گھر بھرا اس بچی کی ہی بدولت۔ عارف تو اپنی طرف سے بیوی کی فاتحہ بھی پڑھ چکا تھا۔ اور اس کی زندگی اس کے واسطے سوہانِ روح تھی۔ ورنہ اب عارف کی کیفیت یہ تھی کہ نسترن سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں، وقت کا آدھا حصہ اس گھر میں گزارتا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نسترن ایسی طبیعت کی عورت تھی کہ یہ سب کچھ دیکھتی اور سنتی، مگر کیا مجال جو کبھی تیوری پر بل آیا ہو۔ وسیم دلہن کا یہ انقلاب اس کے اپنے واسطے تو خیر اچھا ہو یا بُرا کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ عمر کا بڑا حصہ ختم کر چکی تھی۔ اس کی یہ کیفیت لڑکیوں اور بیویوں کے واسطے ایک درس تھی۔ اور اس کے اعمال نے فرقہ نسواں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ عورت کے واسطے صورت ہی نہیں سیرت کی بھی ضرورت ہے۔ وسیم دلہن شکل و صورت کے اعتبار سے آخر ایسی عورت تھی کہ نسیمہ جیسی ساس بہو بنا کر لائی، مگر عادت نے، خصلت نے، سیرت، طبیعت نے، یہاں تک نوبت پہنچا دی کہ ایک بھیک مانگنی تو البتہ باقی رہ گئی تھی۔ ورنہ سب ہی کچھ ہو گیا تھا

ہم نے اس وقت تک اشارتاً یا کنایتہً عارف کو برا نہیں کہا اور تمام ذمہ داری وسیم دلہن کے سر پر رکھی۔ اور اب بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ گزری وسیم دلہن کے اپنے ہاتھوں، عارف بے گناہ یقیناً اور نسترن بے قصور، مظلوم۔ لیکن اب میاں

عارف کا یہ کہنا کہ منکوحہ بیوی تھی۔ بُری یا بھلی، بھرنا تو تھا ہی۔ کب تک غافل رہتا۔ افسوس ہماری رائے میں دُرست نہیں۔ ایک عارف ہی پر کیا موقوف ہے وہ ہو یا اس کے بھائی دوسرے مرد۔ ہم نے اس سلسلہ میں کسی کو ایسا فرشتہ نہ دیکھا کہ بات کی پچ۔ باپ دادا کی لاج۔ بڑوں کی آن، اماں باوا کی بات، نکاح کی بھرن اور پنچوں کی مرن، پر طبیعت کے خلاف بیوی کو بھرا ہو، اور حق یہ ہے کہ اس بحث میں مرد ہی قصوروار نہیں، قدرت کے انتظام اور فطرتی تعلقات بھی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بیس برس کا لڑکا ساٹھ برس کی عورت کو اس لئے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ مرے گا اور بھرے گا۔ ہاں جوان لڑکی کو اگر تقدیر نے بڈھے شوہر کے جنگل میں پھنسا دیا تو وہ بھرے گی اور بھرا ہے۔ دو چار جگہ نہیں، اور دس یا پانچ نے نہیں، ہزاروں جگہ اور لاکھوں نے۔ وہ بھی صورت کے بل اور حسن کے بھروسہ پر نہیں۔ عادت کی بدولت اور خصلت کے طفیل۔ اس لئے بیوی کا فرض اولین، اگر وہ زندگی اطمینان سے بسر کرنے کی خواہش مند ہے تو شوہر کو رضامند رکھنا ہے۔ یہ رضامندی جس قیمت پر میسر ہو سستی اور جس مصیبت سے ہاتھ آئے ارزاں!

وسیم دلہن جب تک شیر اور فرنٹ رہی کتے سے بدتر زندگی بسر کی۔ بچوں کی موت سے علیحدہ ہو کر خود اس کی اپنی زندگی ایسی تھی کہ خدا کسی گھر والی بیوی کو نصیب نہ کرے۔ مگر جب وہ راہ راست پر آئی اور سمجھ لیا کہ جینا ہے تو اطمینان سے جیوں اور رہنا ہے تو عزت سے رہوں۔ اس وقت سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ جس شوہر کی صورت سے بیزار اور نام سے متنفر تھی۔ اس کے قدموں میں گری۔ عارف بھی انسان تھا۔ جانور نہ تھا۔ اس کے جھکنے کی دیر تھی۔ جھکا ہوا سر سر پہ رکھا۔ اس وقت عارفہ کی عمر سال بھر کے قریب ہوگی۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ فرن کی گود میں کوئی

بچہ نہ تھا۔ عارف اور نسترن دونوں گھٹنوں بیٹھے اس کے تماشے دیکھتے۔ اور خوش ہوتے اور باوجودیکہ اس لحاظ سے اب وسیم دلہن اپنی کوشش میں کامیاب اور باغ باغ تھی۔ لیکن ایک طرف دونوں مردہ بچوں کی پھانس ہر وقت اس کے دل میں کھٹک رہی تھی اور دوسری طرف وہ اپنے مظالم کے خیال سے جو اس نے مخلوق خدا پر کئے۔ ان لاپرواہیوں کو سوچ کر، ان نافرمانیوں کو یاد کر کے جو اس نے عارف کی کیں، تھرا اٹھتی تھی۔ گو ضرورت تھی کہ وسیم دلہن کی دلی خواہش یہ ہوتی کہ وہ اس وقت تک زندہ رہے، جب تک اپنے ہاتھ سے اپنی بچی کی شادی کرے۔ مگر اس کی حالت یہ تھی کہ مشکل سے کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہوگا کہ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتا ہو۔ زبان سے تو نہیں۔ اس لئے کہ معلوم ہو چکا تھا کہ گناہ ہے۔ مگر دل میں اس اضطراب سے جو بچوں کی موت ڈال گئی تھی۔ ہر وقت موت کی آرزومند تھی اسی کی یاد تھی۔ نسیمہ کی کیفیت کہ جوان شیر کے غم نے کیا حالت بنا دی تھی۔ اور اس حالت میں وہ اپنی زندگی کس طرح گزار گئی۔ اور آخر لمحہ تک دیدارِ وسیم کی آرزو سینہ سے لگائے رہی اور پروازِ روح کے وقت مقصدِ اصلی حاصل ہو گیا وہی زندگی اس وقت پیش نظر تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ قدم بہ قدم چلوں۔ اور جب یہاں سے چلوں تو دونوں بچے استقبال کو موجود ہوں۔ مگر صورت یہ تھی کہ باوجود سخت کوشش اور محنت کے بھی ہر طرف سے مایوسی کے آثار نظر آ رہے تھے گھر کے دھندوں سے چھٹکارا پا کر عارف کو کھانا دے دلا کر بارہ بجے رات سے بارہا جانماز پر بیٹھی اور گڑگڑا کر روئی کہ کسی طرح ایک کی صورت تو خواب میں نظر آ جائے۔ صبح تک روئی اور دعائیں مانگ کر سوئی۔ مگر اسلام کی صورت دکھائی دیتی نہ سلیم کی۔ جو آنکھیں سخت سے سخت مصیبت میں نم نہ ہوئیں۔ اب ان سے گنگا جمنا بہہ رہی تھی اور وہی دل جو درد کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ مچھلی کی طرح تڑپتا۔ ایک ایک کی منت

کرتی۔ اس لئے نہیں کہ یہ لوگ کام آئیں، بلکہ اس لئے کہ نہ معلوم کس کی دعا لگ جائے کرتی جو ہوتا۔ اور روتی جس قدر رو سکتی۔ مگر دل کا کنول جو مرجھا چکا تھا نہ کھلتا۔ وہ بھی رات کی عجیب گھڑیاں ہوتی تھیں۔ جب سارا گھر بچھونوں پر بے خبر پڑا سوتا تھا اور وسیم دلہن جانماز پر بیٹھی پاٹر بیلتی اور روتی پھونکتی اور سوتی۔ لیکن نماز کام آتی نہ دعا رونا کام آتا نہ التجا۔

ایک روز کا ذکر ہے، اور یہ وہ شام تھی، جس کی صبح عید تھی کہ وسیم دلہن کی ماما شریفاً وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد آئی۔ وہ جس وقت گھر میں داخل ہوئی، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اور اب بھی ان سے آنسوؤں کی لڑیاں زار و قطار بہ رہی تھیں۔ وہ آکر باورچی خانہ میں گھس گئی اور اپنا کام شروع کیا۔ وسیم دلہن اول تو اس کے دیر میں آنے ہی سے کھٹک رہی تھی، اب جو دیکھا تو اس کی چال ڈھال اس کا چہرہ آنکھیں۔ غرض مجسم شریفاً کسی غیر معمولی مصیبت کا شکار معلوم ہو رہی تھی۔ وسیم دلہن نے اس کو پاس بلا کر کہا۔ "کیا ہوا شریفاً آج دیر کیوں ہو گئی؟" وسیم دلہن کا اتنا کہنا شریفاً کے مجروح دل کے واسطے ایک تیر تھا۔ مظلوم ماما نے خاموش آنکھیں مالک کی طرف اٹھائیں۔ نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے نیچے دب گیا۔ اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ خاموش تھی کہ وسیم دلہن نے پھر پوچھا "اری کیا ہوا؟" اب شریفاً بے اختیار ہو گئی اور یہ سمجھ کر شاید دیر ہونے سے بیوی خفا ہو رہی ہیں، کہنے لگی:۔

"ہاں بیگم دیر ہو گئی معاف کر دیجئے۔"

وسیم دلہن۔ "یہ تو دیکھتی ہے کہ برس کا برس دن ہے۔ کتنا کام پڑا ہوا ہے۔ کبابوں کا قیمہ کب سے جھک مار رہا ہے۔ ابالنا۔ پینا۔ تلنا۔ شام ہو گئی۔ کب کھانا پکے گا۔ کب تیار ہوں گے۔ آخر بتا تو سہی رو کیوں رہی ہے؟"

اب شریفاً کا دل اور زیادہ بگڑا۔ وہ روئی اور کہنے لگی:۔

"بیوی کیا بتاؤں دیر ہوگئی۔ معاف کرو۔"

وسیم دلہن۔ "اچھا یہ تو بتا ہوا کیا؟"

اس وقت شریفاً کا دل بالکل بے قابو تھا۔ اس نے بلک کر کہا "میرے بچے کو پکڑ کر لے گئے۔"

وسیم دلہن۔ "اری کون لے گئے، دوپہر کو تو تیرا رمضانی یہاں بیٹھا تھا۔"

شریفاً۔ "ہاں بیگم! آپ سے کل دو روپے لے کر کرتہ کا کپڑا لائی۔ عید کے واسطے تیار کیا کہ صبح آپ کے کام سے چھٹی پاؤں، پھر اپنے گاؤں ہو آؤں گی۔ ہاتھوں کی چوڑیاں دو روپے بدلے رکھ اس کی جوتی لائی۔ برس بھر مجھے گھر گئے ہوگیا۔ وہ بھی بچہ ہے خوش ہو رہا تھا کہ کل گاؤں چلیں گے۔ عید کا دن ہے۔ میں نے ہزاروں منتیں کیں مگر پیش کار جی نے ایک نہ سنی، چپڑاسی پکڑ کر لے گیا۔"

وسیم دلہن "اری کیسا چپراسی، کیسے پیش کار، کیا کہہ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ رو مت۔ بات سمجھا کر کہہ۔"

شریفاً کا رونا کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ ہر چند وسیم دلہن سمجھاتی تھی، لیکن اس کا دل اور زیادہ بھرا چلا آرہا تھا۔ اس نے اسی حالت میں کہا:

"اے بیوی مصیبت کا کیا پوچھنا بے وارثوں کا وارث اللہ ہے۔ نصیر چپڑاسی میرے گھر کے پاس رہتا تھا۔ مجھ سے کہا۔ اس لڑکے کو پیش کار جی کے ہاں رکھوا دے میں نے کہا بھائی پڑھتا ہے۔ دو چار حرف آجائیں گے۔ روٹی کھائے گا جب تک میں زندہ ہوں محنت کروں گی اور اسے پالوں گی" نصیر کہنے لگا "وہیں پڑھوا دیں گے۔ نوکری کے واسطے نہیں لے جاتا۔" میں خاموش ہوگئی، وہ لے گیا۔ آج صبح کو میں نے بلایا۔ آگیا دن بھر کھیلتا پھرا۔ گھر چلنے کی خوشی میں باغ باغ تھا۔ دن بھر کرتہ اور جوتی بغل میں ہی بیٹھا گن گنا رہا تھا کہ پیش کار اور نصیر دونوں درانہ گھر میں گھس آئے۔ بیگم میری

آنکھوں کے سامنے اس کا کرتہ اور جوتی چھین کر کیچڑ میں پھینک دی اور بے گناہ اور بے قصور مارنا شروع کیا۔ میں دیکھ رہی تھی اور بچہ پٹ رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں جا کر پیش کار کے قدموں میں گر پڑی کہ خدا کا واسطہ نہ مارو، تم حاکم ہو، ہم غریب ہیں مگر وہ کان پکڑ کرلے گئے۔ میں روتی پیٹتی ہاتھ جوڑتی قدموں میں سر رکھتی ساتھ گئی۔ ان کی بیگم کی منتیں کیں۔ مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ بچہ لہو لہان ہو گیا، تو پیش کار جی نے کہا

"دس روپے تجھ پر ہیں۔ وہ دے جا اور چلا جا۔"

"اے بیگم بچہ وہاں بیٹھا ہے۔ اور میرے کلیجے کی آگ مجھے بھون رہی ہے خبر نہیں اور کتنا مارا ہوگا۔ بیگم میرا بچہ بے قصور ہے۔ میں نے اس کو پھنسوایا، اس وقت کس سے دس روپے لے کر اس کو چھٹواؤں"، شریفاً نے اتنا کہہ کر چیخ ماری اور پھر کہا:۔

"اے بیگم اپنی بچی کا صدقہ دس روپے دے دو۔"

وسیم دلہن اب وہ وسیم دلہن نہ تھی۔ شریفاً کی بپتا پر اس کا دل بھر آیا اور بچھڑے ہوئے بچوں کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی، روتی ہوئی اندر گئی اور دس روپے لا کر شریفاً کو دیئے اور کہا۔

"جا اپنے بچہ کو لا۔ خدا تیری مامتا ٹھنڈی رکھے۔"

(۱۶)

"لیجئے چچی جان! جس مکار کے ایثار کا آپ دن رات کلمہ پڑھتیں، اور جس بے مروت کی محبت کے آپ شب و روز گیت گاتی تھیں۔ اس کی قلعی کھل گئی۔ اگر میں اس کسوٹی پر فاطمہ کو نہ کستا تو وہ اس قدر عیار تھی کہ قیامت تک اس کا بھرم نہ کھلتا۔ آپ کا الزام عمر بھر مجھ پر رہتا اور آپ یہی سمجھتیں کہ وہ اللہ والی اور میں سنگ دل!"

بلقیس "کیا ہوا؟"

احسان۔ "آپ کو خبر نہیں کیا ہوا؟ لیجئے میں بتاؤں!"

بلقیس :۔ "کہو؟"

احسان ۔ "آپ کے سامنے میں نے ابا جان سے کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارا ہار فاطمہ نے جان کے برابر رکھا ۔ اور کسی حالت میں اس کو علیحدہ نہ کیا تو بے شک وہ وفادار ہے اور امید ہے کہ وہ آیندہ بھی شکایت کا موقع نہ دے ۔ لیکن اگر اگر اس نے وہ ہار علیحدہ کر دیا ، تو اس کی بے وفائی ظاہر اور خود غرضی ثابت ، وہ اپنے گھر خوش ، میں اسے طلاق دوں گا اور پیچھا چھڑاؤں گا ۔ روپیہ پر بنی ہو بنی ۔ جان کو تو سکھ ہو گا ۔ اماں جان نے ثریا کے ہاں بھی یہی کہلا بھیجا تھا کہ اگر فاطمہ کے پاس ہار موجود ہے تو اس کو طلاق نہیں ہو سکتی ، تم یوں ہی نکاح کر لو ۔ اس وقت ثریا کے باپ کا پرچہ آیا ہے کہ ہار زلیخا تے نہیں فاطمہ نے کوئی پندرہ روز ہوئے دو سو روپے کا ہمارے ہاتھ بیچ ڈالا ۔ منگوا لیجئے ۔ نکاح بغیر طلاق کے نہیں ہو سکتا ، پہلے طلاق پیچھے نکاح ۔"

بلقیس ۔ "بس تو ان کے پاس موجود ہو گا ۔"

احسان ۔ "موجود کیا ہو گا ، یہ لیجئے ۔"

بلقیس ۔ "ہاں وہی ہے ۔"

احسان :۔ "اب کیا فرماتی ہیں ، اب آپ کو معلوم ہو گیا وہ کس قماش کی عورت ہے ؟"

بلقیس ۔ "وہ جس قسم کی بچی ہے میں خوب جانتی ہوں ۔ ضرورت بری چیز ہے ۔ خدا کسی پر وقت نہ ڈالے سب کچھ کر بیٹھتا ہے ۔"

احسان ۔ "واہ چچی جان واہ ! آپ نے خوب داد دی ۔"

بلقیس ۔ "تم نے فاطمہ کو بھی تو پرچہ لکھا تھا ۔"

احسان ۔ "جی ہاں جواب کا انتظار کر رہا ہوں ۔ آدمی ابھی واپس نہیں آیا ۔"

"لیجیے وہ آگیا۔" آدمی کی آواز سن کر احسان باہر گیا اور دس منٹ میں بگڑتا ہوا واپس آیا۔ صندوقچہ بلقیس کے سامنے پھینک دیا اور کہنے لگا۔

"ہشیار، عیار، مکار! اللہ غنی کیا شتا عورت ہے! پرچہ کو سنئے پھپھڑ دلالوں کو دیکھیے! صندوقچہ کو ملاحظہ فرمایئے اور چال بازی کی داد دیجیے، کیا فرماں بردار اور عاشق زار منکوحہ ہے کہ ہار کو خود ہاتھ نہ لگانا کہ تم بیمار ہو جاؤ۔ صندوقچہ میں بھیجا ہے کھول کر دیکھیے۔ ہار کے بدلے کتے لوٹ رہے ہیں! اچھی جان! برا نہ مانئے۔ آپ نے تو میرے پھنسانے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ اللہ ہی نے بچایا۔ فاطمہ اور ثریا دونوں سے باز آیا۔ مجھے تو اپنی غلامی میں لیجیے۔ میں نے ابا جان سے طے کر لیا۔ ساتوں گاؤں دلہن کے نام لکھدیں گے۔"

بلقیس۔ "اس کے متعلق تو مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی تھی۔ تم گھڑی گھڑی کہہ کر مجھ کو کیوں محجوب کرتے ہو۔"

(۱۷)

وہ معصوم بچی جس نے آدمیوں کے بھرے مجمع میں آنکھ کھولی۔ ماں باپ کے چاؤ چونچلوں میں ہیٹا اور نوکروں کی ہاتھوں چھاؤں جوان ہوئی۔ اسی کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ اس عالم تنہائی میں عزیز نہ قریب، محلہ نہ پڑوس بدنصیب پر کیا گزرتی ہوگی۔ زلیخا کی موت تو مصائب کا پورا پہاڑ فاطمہ کے سر دھر گئی۔ مگر تنہائی کی مصیبت ایسا لاعلاج مرض تھا، جس کا کوئی تدارک ممکن ہی نہ تھا۔ جدھر دیکھتی تھی خاموشی اور جہاں نظر ڈالتی تھی سناٹا۔ جلیس، انیس، عزیز، قریب، پتھر، اینٹیں، دیواریں! سر پھوڑو یا مغز مارو۔ کئی دفعہ قصد کیا کہ تعلقات بڑھاؤں میل جول پیدا کروں۔ دیوار بیچ نواب صاحب رہیں۔ ان کے برابر ٹھیکیدار۔ آگے بڑھ کے میر منشی، شریف لوگ، سمجھدار آدمی، قدردان بھی اور ملنسار بھی۔ بالخصوص نواب صاحب کی عورتیں کہ اڑ کر ملنے اور اندھا دھند لپٹنے والیاں

فاطمہ اگر جھوٹوں رُخ کرتی تو ایسی نیک، اور سیدھی بیبیاں تھیں کہ بوڑھیاں اور بایاں بھاوجیں اور سالیاں ایک دم کو پیچھا نہ چھوڑتیں۔ مگر کواری اور سیانی بچی والی نہیں، وارث نہیں، ساتھی نہیں، حمایتی نہیں۔ عزت موتی کی سی آب اور واسطہ مسلمانوں سے کہ یہ ظالم جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ ہو وہاں پہاڑ لا بٹھائیں۔ شب و روز اپنے کونہ میں بیٹھی وقت گزارتی۔ جی گھبراتا۔ طبیعت پریشان ہوتی۔ لیکن کس سے کہتی اور کیا کہتی۔ ہر چند سوچتی اور لاکھ غور کرتی مگر کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی۔ دن جھگڑوں میں گزرتا اور رات آنکھوں میں۔ رات کو جب آدھی یا پچھلے سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی۔ گزرے ہوئے دن اور بیتے ہوئے جلسے یاد آتے تو دل ہوا ہو جاتا۔ آپ ہی آپ قلب مضطرب ہوتا! رات کی طولانی گھڑیاں سر پر اور مکان کی قہقہہ دیواریں پہلو میں! وہ تو خدا بھلا کرے رحم دل بلقیس کا کہ اس کا ایک بڈھا نوکر رات کو بلا ناغہ آکر سوتا اور دن کو بھی دو ایک پھیرے کر لیتا اور اس کی بدولت ایک آدھ عورت گھڑی دو گھڑی کو اور بھی آجاتی۔ ورنہ تعجب نہیں زندگی کی یہ کیفیت فاطمہ کو دیوانہ بنا دیتی۔ بیماری کے تمام مراحل طے ہو چکے تھے اور اب یہ مجسمہ ایک چاند تھا۔ جو اس ویران گھر میں چمک رہا تھا غریبی اور افلاس کی مصیبت زلیخا کے دم کے ساتھ ختم ہوئی۔ اب فاطمہ کی دسوں انگلیاں دس چراغ تھے۔ جن کی روشنی نے تمام شہر منور کر دیا اور اس کی دستکاری نے دھوم مچا دی۔ حسین آباد کی نمائش میں ایک رومال پر ہزار روپیہ انعام ملا۔ احسان اپنی دولت کے زعم میں کتنا ہی بدمست ہو مگر فاطمہ محض اپنی محنت کی بدولت آج اس لائق ہو گئی تھی کہ احسان جیسے دس کو روٹی کھلا دیتی۔ وہی گھر جس میں ٹوٹے ہوئے جھلنگوں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اب دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ فرش فروش کے علاوہ انواع و اقسام کے پھول صحن مکان کو جبین عروس بنا رہے تھے۔ زیور بھی تھا، باسن بھی تھا۔ روپیہ بھی تھا۔ پیسہ بھی۔ مگر اس لگی کا کیا علاج کہ زبان پر رٹ تھی تو احسان کی،

اور دل میں خیال تھا تو احسان کا۔ شرافت تھی، فرض تھا۔ فرماں برداری تھی، انسانیت تھی۔ صحیح تھی یا غلط اور جائز تھی یا ناجائز۔ ہم کو تو فاطمہ کی ان حرکتوں پر غصہ آتا ہے سنگ دل احسان اس حور کے مقابلہ میں حیوان ثابت ہو چکا۔ سر سے کنواں کھودتا تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی، نہ یہ کہ وہ بھاگے یہ لپٹے، وہ بچے یہ چمٹے۔ غضب خدا کا روسیاہ انسانیت کی اس تصویر کو بیدردی سے ٹھکرائے جو کنبہ اور خاندان کیا اسلام کا مول تھی اور مظلوم اسی کا کلمہ پڑھے

وسط مکان میں فاطمہ آرام کرسی پر بیٹھی ایک میز پوش کاڑھ رہی تھی۔ گلاب کے دو پھول اپنی شاخوں پر جھوم کر دائیں بائیں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے شام کے چھ بجے ہوں گے کہ بلقیس فاطمہ کے دروازے میں داخل ہوئی۔ اس سے چند قدم آگے ایک اور عورت تھی۔ اس کو جاتا دیکھ کر بلقیس ٹھٹک گئی۔ عورت اندر گئی، سلام کیا تو فاطمہ جو اپنے کام میں منہمک تھی اچھل پڑی، کام چھوڑ دیا اور کہا "تشریف لائیے کہاں سے تشریف لائیں اور کس کے پاس"

عورت۔ "بیوی تمہارے پاس آئی ہوں اور یہیں سے آئی ہوں"

فاطمہ۔ "حکم"

عورت۔ "ایک ضرورت ہے"

فاطمہ۔ "کیا میں اس قابل ہوں کہ کسی انسان کی ضرورت میں کام آؤں"

عورت۔ "میں نے تو یہی سنا ہے۔ ممکن ہو تو کوشش کیجیے"

فاطمہ۔ "فرمایئے، سر آنکھوں سے کوشش کروں گی"

عورت۔ "بیوی میری داستان جگر خراش ہے اس کا ہر فقرہ تیر اور ہر جملہ نشتر کا کام کرے گا۔ صاحب اولاد تڑپ اٹھے گا۔ صاحب ایمان بلبلا جائے گا اور مسلمان کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ موجودہ اسلامی دنیا سے مدد مانگنے کا حق نہیں اور شاید میری زیادتی ہو گی اگر میں ان کے عیش اور اطمینان کی گھڑیاں اپنی

مصیبت سنا کر منفعل کروں۔ وہ میری بپتا سن کر منہ پھیرلیں۔ وہ میری التجا ٹھکرادیں۔ تو مجھے شکایت نہیں ہوسکتی۔ لیکن بیگم! ایک مصیبت زدہ بیوہ جس کے سر پر کوئی وارث نہ ہو حق رکھتی ہے کہ ہر مسلمان کو اور ہر صاحب ایمان کو ہر مرد کو اور ہر عورت کو اپنا وارث سمجھے مگر آج وہ وقت ہے کہ پاؤں تلے کی چیونٹی بھی میری دشمن ہے۔ کوئی مجھ سے بات کرنے کا روادار نہیں اس لئے کہ مصیبت زدہ ہوں، دنیا مجھے ٹھکرا رہی ہے۔ اہل غرض ہوں۔ لوگ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ بیوی میرا شوہر ریاست جودھ پور میں سرشتہ دار تھا۔ ہماری آمدنی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے قریب تھی۔ خدا ہم سے خوش تھا۔ اس دولت کے استعمال کے لئے اس نے ہم کو ایک بچی بھی دی تھی جس پر ہم دونوں میاں بیوی پروانہ وار نثار تھے۔ اگر میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھ سے زیادہ دنیا میں کوئی ماں اپنی اولاد پر فریفتہ ہوگی تو یقیناً کہہ سکتی ہوں کہ ہر عاشق نثار ماں اتنی ہوگی جتنی میں۔ قانون قدرت کے موافق ہر بیج پھل پھول کو ننا اور ہر پھول کھل کر مرجانے والا ہے۔ وہ بچی جو ٹھمک ٹھمک کر ہاتھوں میں آئی اور گودوں میں جھولی۔ بالآخر سیانی ہوئی۔ دس بارہ سال آنکھ بند کرکے گزر گئے۔ بیوی تم سمجھ سکتی ہو۔ بیٹیاں بادشاہوں کی نہ بیٹھیں۔ یہ خدائی انتظام ہیں۔ جہاں دولت اور حکومت سب ہیچ۔ بچی جوان ہوئی شادی کا فکر ہوا۔ بیسیوں باتیں۔ سینکڑوں پیام آنے شروع ہوئے۔ محبت نے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے اور دولت نے کانوں میں ٹینٹیاں بھردی تھیں۔ کوئی پیام سمجھ میں نہ آیا۔ کسی بات پر دل ٹھکا۔ اچھے اچھے رقعے واپس اور بڑے بڑے پیام رد۔ دنیا اپنے بسنے والوں کو نت نئے شعبدے ہر وقت اور ہر لمحہ دکھارہی ہے۔ اس بازی گر کے بہروپ سمجھنے والوں کے واسطے عبرتناک اور ناسمجھوں کے لئے خاک! میں نے ایک چھوڑ دو جوان بھائیوں کی موت سنی۔ مچھاتی لاشیں میرے محلہ سے نکلیں۔ جوان شیر میری آنکھوں کے سامنے پیوند زمین ہوئے۔ کڑیل جنازے میں نے اپنے ہاتھوں سے دھوئے مگر میرے کان پر جوں نہ چلی۔ جب نہ سمجھی۔ مگر اب کہتی ہوں کہ یہ واقعات اس لئے تھے کہ میری آنکھیں

کھلیں، مجھے ہوش آئے۔ لیکن غفلت نے مجھے اور زیادہ بے ہوش کیا۔ یہاں تک کہ ہیضہ نے چند گھنٹوں میں سرشتہ دار صاحب کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

اب وہ وقت تھا کہ جن کا سرکار اور حضور کہہ کر منہ خشک ہوتا تھا وہ آکر جھانکتے تک نہ تھے۔ گھر میں۔ ایک میں اور دوسری میری بچی افروز جن سے کچھ مدد کی توقع تھی، وہ خواہ مخواہ کے قرضخواہ بن گئے۔ آمدنی بند، خرچ بدستور۔ چند روز میں صفایا ہوگیا۔ ارادہ کیا کہ وطن جاؤں۔ لیکن وہاں بھی عزیزوں میں اب اللہ کا نام تھا۔ سوچا شاید ریاست سے کچھ گذارہ مل جائے۔ مگر کون کس کے کام آتا ہے۔ ہر وقت کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ طوطے کی طرح دیدے بدل گئے۔ ایک سال اسی طرح شتم پشتم گزرا۔ بچی کا پہاڑ چھاتی پر تھا جو کسی طرح سرکائے نہ سرکتا تھا۔ ہمارا اہمد نہ معلوم کب سے تاک میں تھا۔ ظالم نے گھر کی مٹی لے ڈالی یہ غلط کہ خدا اپنی قدرت کے تماشے دکھا رہا تھا۔ مسلمان خدا پر الزام رکھنے کے بادشاہ ہیں جو تکلیف ہے وہ من جانب اللہ اور جو مصیبت ہے خدا کی بھیجی ہوئی۔ میری اذیت ظاہر تھی جو بویا وہ کاٹوں گی، جو کیا وہ بھگتوں گی۔ دو دو ڈھائی ڈھائی سو کے اہلکار۔ آٹھ آٹھ، دس دس گاؤں کے جاگیردار سمجھ میں نہ آئے اب پندرہ روپیہ کا روبکار نویس نہ ملتا تو کیا ملتا۔ بچی کی عمر ڈھل رہی تھی سوچا کہ بلا سے ایک وارث تو کھڑا ہو جائے گا۔ نکاح کر دیا۔ داماد صاحب کی پہلی عنایت تو یہ ہوئی کہ نوکری چھوڑ کولے سے آگئے اور دوسری یہ کہ عیسائیوں کے قبضہ میں پھنس بیوی کو ساتھ لے گرجا کے پاس جا بسے۔ بیٹی کے نکاح نے داماد کا خرچ اور بڑھا دیا اور خرچ بھی شاہی۔ غضب خدا کا ملانوں کی صورت آدمی منڈا ہوا سر پھنسی ہوئی ٹوپی لمبی ڈاڑھی۔ دھاگا مونچھیں۔ کچھ ایسی ہوا لگی کہ ڈاڑھی چٹ لمبی مونچھیں آڑی مانگ۔ ننگا سر۔ غرض اس کی تو کچھ ایسی کایا پلٹی کہ عقل اور قیاس دونوں متحیر و متعجب ہیں۔ اس کا شوق تازہ اور امنگیں نئی تھیں۔ مصیبت میری بچی کی تھی جس نے میرے حکم کے روبرو گردن خم کی اور اس گائے کی طرح جو قصائی کے ہاتھوں فروخت ہو کر نیچی گردن کئے پیچھے جا رہی ہو۔

خطبۂ نکاح کے بعد اس کے ساتھ ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ افروز پہلی لڑکی ہے جس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا۔ دنیا کے انقلاب نے نہ معلوم کتنے معصوم دل اپنے نشانوں سے چھلنی کئے ہونگے مگر اس کی مصیبت کا ایک پہلو اس قدر جگر خراش اور اتنا سنگین ہے کہ ہر وہ دل جو ایمان کی روشنی سے جگمگا رہا ہے اس کی مصیبت پر دہلے گا، لرزے گا اور کانپے گا۔ مجھے اس شکایت کا حق نہیں کہ باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھا۔ وہ یتیم ہوئی۔ بے وارثی ہوئی۔ بیشک ہوئی مگر انوکھی نہیں، دنیا میں اور بھی ہوئی ہیں اور سب ہوتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں کہ باپ کی موت نے شول کا ریشمی جوڑا اس کے جسم سے اتارا۔ اب افلاس کا پھٹا برقع اس کے سر پر ڈال دیا۔ عیسائی کارکن جن کے محلہ میں بدبخت شوہر جا کر آباد ہوا اور مظلوم بیوی کو آباد ہونا پڑا مسلمان نہ تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے اسلام کی تذلیل و تضحیک ہو اور ان کے کان پر جوں نہ چلے۔ مردوں اور عورتوں کا متفقہ گروہ اس نامعقول انسان کے ناپاک جذبات کے استقبال کو آگے بڑھا۔ دن رات کی صحبت اور ہر وقت کی تلقین نابکار خود سر ہوا اور بیوی کو عیسائی ہونے پر مجبور کیا۔ اگر اس کو تسلیم بھی کر لوں کہ مسلمان عورت کی زندگی کا بہترین مقصد یہ ہے کہ وہ صرف شوہر کے احکام پر لبیک کہے اور لڑکی کے والدین اور بالخصوص ماں کا یہ فرض ہے کہ وہ عقیدہ بچی کی رگ رگ میں پیوست کرے تو خدا معلوم اس کا جواب کون دیگا اور کیا دیگا اور کس کو دینا چاہیے کہ احکام کے جائز ناجائز کا امتیاز کس طرح ہوگا اور عقیدہ کو ذہن نشین کرنے سے پہلے لڑکی میں امتیاز کی قابلیت پیدا کرنی بھی ضروری ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو میں قابل معافی ہوں کہ عورت کی فرماں برداری کی توقع مسلمان مردوں پر اس بری طرح سوار ہوئی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب توقع سے امتیاز کی سطور قطعاً کاٹ دی ہیں۔ بیگم خیال فرمایئے کیسا نازک وقت ہے، خوبصورت سے خوبصورت بنی ٹھنی عیسائی لڑکیاں شوہر کے گلے کا ہار ہیں۔ اور جب تک ایک ناتجربہ کار لڑکی اسلام کے سدا بہار پھولوں کو اپنے قدموں سے نہ مسل دے۔ شوہر اس کا نہیں ہوتا۔ اس وقت تائید غیبی اس کی حمایت کو آگے بڑھی۔ اس نے

روحانی اور جسمانی دونوں اذیتیں گوارا کیں اور ارتداد سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی بربادی گوارا کی۔ اور میرے پاس آ گئی۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اس کے ایثار کی داد دی۔ اس کے صبر پر آفریں کہی اور اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کو آئے سولھواں روز تھا۔ دوپہر کے وقت وہ نہا کر اٹھی۔ پوری طرح کپڑے بھی نہ پہنے تھے۔ بال نچوڑ رہی تھی کہ وہ بدبخت تین چار آدمیوں سمیت گھر میں گھس آیا اور اس کو زبردستی اٹھا لے گیا۔ میں آج کہوں۔ کل کہوں۔ جب تک زندہ ہوں اس وقت تک کہوں۔ خدا کے سامنے کہوں۔ رسولؐ کے روبرو کہوں۔ میں نے محلہ والوں کی پناہ لی۔ یہ مسلمان تھے۔ میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے اپنے پردہ کو آگ لگائی۔ ان کو سارا قصہ سنایا۔ ان کے قدموں پر سر رکھا کہ کوئی اللہ کا بندہ میری بچی کو بچائے لیکن ایک متنفس نے میری التجا پر کان نہ دھرا اور یہی کہا "اس کی بیوی ہے وہ مالک ہے تو جھوٹی ہے اور بکتی ہے۔" وہ ہر چند روئی، چیخی چلائی اور پیٹی۔ مگر آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودگی میں اس مظلوم کا تانگہ روانہ ہو گیا اور مس صاحب نے اسی وقت شمس آباد کے گرجا میں روانہ کر دیا۔ میں چاروں طرف پھری کونہ کونہ ڈھونڈھا مگر کسی جگہ پتہ نہ چلا۔ اولاد والے سمجھ سکتے ہیں کہ بچی کی جدائی نے میری کیا کیفیت کر دی ہوگی۔ کون سا در تھا جو میں نے چھوڑا۔ اور کس کا گھر تھا جو میں نے نہ جھانکا۔ دن بھر پھرتی اور رات بھر روتی ایک ایک کا منہ اس توقع پر تکتی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ میرے زخم پر مرہم رکھے لیکن بیوی کس کی بکری، کون ڈالے دانہ گھاس۔" پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ تھک کر چور ہو گئی۔ مگر دل کی لگی نہ بجھی گیارہ مہینے اسی طرح دن رات ایک کئے تو ایک روز جب عیسائی چماریوں نے کتے کو میرے پیچھے ہشکارا اس وقت ایک اللہ کا بندہ جو مس صاحب کا خانساماں تھا۔ میرے پاس آیا۔ اور صرف اتنا کہا کہ "افروز شمس آباد میں ہے اور بیمار ہے۔" بیگم میں نے آپ کا وقت ضائع کر دیا۔ آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

فاطمہ۔ "نہیں آپ فرمائیے میں غور سے سن رہی ہوں۔"

عورت "آپ کا دل بھر آیا۔ آپ پہلی انسان ہیں جسکے آنسوؤں نے میرا زخم دھویا"

فاطمہ "آپ فرمائیے اور میرا خیال نہ کیجئے"

عورت "ہاں بیگم اتنا سنتے ہی ہوش جاتے رہے۔ پیسہ پاس نہ تھا اسی طرح پاؤں پیدل شمس آباد روانہ ہوئی مجھے ان لوگوں سے کہنا نہیں ہے جو یقین کرنے میں تامل کریں متواتر سات روز تک میرے منہ میں اڑکر دانہ نہیں گیا جنگل میرے واسطے بلرغ تھا اور راستہ میرے لئے صاف۔ ببول کے کانٹے اور راستے کے گوکھرو میرے صلاح کار تھے اور میں ان چشموں اور کنوؤں کی احسان مند ضرور ہوں۔ جنھوں نے اپنی دولت سے میری پیاس بجھائی۔ میں آٹھویں روز صبح کے وقت شمس آباد پہنچی۔ گرجا کا رستہ لیا۔ بیں دروازہ ہی میں تھی کہ ادھر سے وہ نابکار سیٹی بجاتا چلا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عیسائی عورت تھی۔ میں دیکھتے ہی بیتاب ہوگئی اور بہ منت پوچھا "میری افروز کہاں ہے؟" اس نے قہقہہ مارا اور کہا "اگر تم عیسائی ہونا قبول کرو تو بتادوں" میری آنکھ میں آنسو آگئے، ہاتھ جوڑے اور کہا "اس لئے نہیں کہ میں تیری ماں ہوں۔ اس لئے نہیں کہ تو میری بچی کا شوہر ہے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ میں ماما کی ماری ہوں میرا سینہ کھول رہا ہے۔ میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ میری حالت بگڑ رہی ہے۔ تو اپنی جوانی کا صدقہ ایک لمحہ کو مجھے افروز کی صورت دکھا دے" اس نے اور قہقہہ مارا اور کہا۔ "کل اسی وقت آؤ"

اگر مخبر صادق کا پیام یوم الحق درست ہے۔ تو ببول کا وہ درخت جس کے نیچے میں نے جاڑے کی وہ رات جس میں دانت سے دانت بج رہے تھے۔ ایک چادر میں بسر کی میری حالت کی شہادت دیگا۔ رات میری آنکھوں میں کٹی یہاں تک کہ گرجا کے گھنٹے نے گریبان شب چاک کیا اور علی الصباح کوٹھی کے دروازہ پر پہنچی، دل کی کیفیت کیا تھی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہر طرف دیکھ رہی تھی کہ ایک سنگدل عورت نے اتنا کہا اور چلی گئی۔

"افروز سخت بیمار ہے۔ وہ اور اس کا شوہر رات کو چلے گئے۔ تم وہیں جاؤ"
اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھ پر کیا گذری۔ الٹے پاؤں۔ لوٹی۔ اس وقت صبح کو جب یہاں گرجا میں داخل ہوئی ہوں تو وہی بھلا مانس کھڑا تھا۔ کہنے لگا:۔

"ابھی افروز کا انتقال ہوا۔ ہم اس نامعقول عورت کو جس کا کلمۂ محمدی پر خاتمہ ہوا ہرگز رکھنا نہیں چاہتے۔ ہرچند کوشش کی کہ وہ راہ راست پر آئے مگر اسلام اسلام رٹتی رہی۔ ہم اس کے ناپاک جسم کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ اگر تم ایک گھنٹے کے اندر اسکو نہ لے گئیں۔ تو ہم اسکی لاش لاوارث بنا کر ڈاکٹری کالج میں چیر پھاڑ کیواسطے دیدینگے۔"

غالباً مجھے حق تھا کہ میں خطبۂ نکاح کے وہ الفاظ اس وقت اس کو یاد دلاؤں جس نے میری بچی کو اپنی بیوی بنا رکھا۔ یقیناً میں حق بجانب ہوتی اگر اس کو ان وعدوں کی طرف متوجہ کرتی۔ جن کا یقین دلا کر اس نے میری بچی کو میری آغوش سے لیا۔ مگر میں ایک پتھر کی طرح جس میں حرکت نہ ہو۔ اس کا منہ دیکھتی رہی۔ افروز کی خبر موت نے میرا دل توڑ دیا۔ جب وہ چلنے لگا۔ تو میں نے اس سے کہا "لاؤ اس کی لاش مجھے دے دو۔"

وہ مجھے ایک کمرہ میں لے گیا۔ جہاں میری ان آنکھوں نے دیکھ لیا کہ میرے کلیجے کا ٹکڑا افروز پھٹے پرانے کپڑوں میں مردہ پڑی ہے۔ وہ اور اس کی عیسائی بیوی دونوں کھڑے تھے۔ میں اپنی بچی کو لپٹ گئی۔ اس کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ میں مدت کی بچھڑی ہوئی تھی۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ جو زندہ صورت تانگہ کے وقت مجھ سے جدا ہو رہی ہے اب میں اسے مردہ دیکھوں گی۔ میں نے بیتاب ہو کر ایک چیخ ماری تو عیسائی عورت نے کہا۔

"تم ایک ٹھیلہ لے آؤ اور اس کو لے جاؤ۔ یہ کمرہ دھویا جائے گا۔ جلدی کرو۔ اگر یہ عیسائی ہو جاتی تو ہم اس کو دلھن بنا کر پھولوں میں دفن کرتے مگر اس کی تقدیر میں ٹھیلہ تھا بہت جلدی کرو ہم لاش زیادہ دیر تک نہیں رکھ سکتے" میں بے شک قصوروار ہوں کہ افروز کو ٹھیلہ پر لانا مجھ سے گوارا نہ ہوا۔ اور میں نے کہا "میں اپنی بچی کو گود میں لے جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کو اٹھا لیا۔ اور باہر آئی۔ گرتی پڑتی احاطہ سے باہر نکلی۔ مگر اس کے بعد نہ چل سکی۔ آخر میں نے تانگہ والوں سے کہا۔ گاڑی والوں سے درخواست کی۔ اور یہ جتا دیا کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ مگر کسی نے توجہ نہیں کی۔ ہاں مجھے دو تین انجمنوں کے پتے بتائے گئے۔ اور ایک شخص یہ کہہ کر بھی گیا کہ میں انجمن میں جاتا ہوں مگر اس وقت تک نہ وہ لوٹا نہ کوئی انجمن سے آیا۔ اب اس وقت ایک برقع والی نے ترس کھا کر مجھ کو آپ کا پتہ بتایا اور کہا تم جاؤ میں مردہ کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"بیگم! یہ میرا پردیس ہے۔ میں آپ سے روپیہ پیسہ نہیں مانگتی۔ صرف اس قدر التجا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے سپرد زمین کر دیجئے کہ مردہ کی مٹی پلید نہ ہو اور میری بچی کی لاش مردوں کے ہاتھوں میں نہ پڑے۔"

عورت کی گفتگو ختم ہوئی تو اس نے دیکھا فاطمہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور عورت سے کہا۔

"آپ اطمینان رکھئے۔ میں جان و مال سے ہر طرح حاضر ہوں۔ آپ فوراً گاڑی کرایہ پر کیجئے اور جو مانگے اس کو دے کر لاش یہاں لے آئیے۔ میں تمام سامان کرتی ہوں۔ یہ پچیس روپے اپنے ساتھ لے جائیے۔"

عورت کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ اس نے روپیہ ہاتھ میں لئے اور ایک نظر فاطمہ کے چہرے پر ڈالی۔ اس نگاہ میں تعجب تھا۔ حیرت تھی۔ کرم کا شکریہ تھا احسان کا اعتراف تھا وہ چلی گئی۔ تو فاطمہ خوب روئی وہ اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق تھی کہ بلقیس کا مطلق خیال نہ تھا۔ دروازے پر آ کر بڑے میاں سے کفن اور ضروری چیزیں منگوائیں۔ اور خود پانی گرم کیا اور روتی رہی۔ بلقیس اب تک خاموش بیٹھی فاطمہ کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ عورت لاش لئے آ پہونچی اب البتہ بلقیس آگے بڑھی۔ مردہ کے اندر لانے میں، نہلانے میں کفنانے میں مدد دی۔ مسجد سے کچھ مرد

بلائے گئے۔ مُردہ ان کے سپُرد ہوا۔ اور جب عورت چلنے لگی۔ تو فاطمہ نے اُس سے کہا۔ "یہ آپ کا گھر ہے۔ میں آپ کی کنیز ہوں، کہاں جائیے گا۔ اور کیوں جائیے گا یہاں قیام کیجئے گھر کو اور مجھ کو اپنا سمجھئے اور بقیہ زندگی اس گھر میں بسر کر دیجئے"۔

(۱۸)

جب وسیم دلہن کی عنایت کی بدولت پردۂ فنا پر وہ ساعت آئی۔ کہ ماتا کی ماری شہیفا کا بچہ اس کے سینے سے چمٹا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو وسیم دلہن نمازِ عشا سے فراغت پاکر خدائے برتر کے حضور میں جانماز پر سجدہ میں گرگڑا گرگڑا کر التجا کر رہی تھی کہ صرف ایک دفعہ ان بچوں کی صورت خواب میں دیکھ لوں۔ جن کی ہڈیاں گل کر خاک ہو چکیں۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ احمد آباد جاکر سلیم کی قبر کو کلیجے سے لگالوں۔ کالے پانی پہنچ کر اسلام کے مدفن کو بوسہ دوں۔ مگر اس ارادہ کی تکمیل آسان نہ تھی۔ کالا پانی تو دور کنارا احمد آباد کی آرزو بھی پوری نہ ہوسکی۔ وہ بظاہر دُنیا کی تمام ضرورتوں میں تھی۔ عارفہ کی پرورش عارف کی خدمت، گھر کا اہتمام، خانہ داری کا انتظام سب ہی کچھ کر رہی تھی۔ اور ہو رہا تھا مگر درحقیقت دو ناسور جو کلیجے میں پڑ چکے اور دیکھنے والوں کو نظر بھی نہ آتے تھے۔ اندر ہی اندر رس رہے تھے۔ اور ان کا فسادِ دورانِ خون کے ساتھ دل اور جگر کلیجہ اور پھیپھڑا سب برباد کر رکھا تھا۔ وہ جس وقت عارفہ کو فرطِ محبت میں سینہ سے چمٹاتی تھی۔ بچی ہمک ہمک کر ماں کی گود میں اس کو نہال نہال کرتی تھی اور جب اپنی بھولی بھالی باتوں سے اس کے مُردہ دل کا کنول کھلاتی۔ ٹھیک اسی وقت جب زندگی کی بہاریں اس کو چونچال کرتیں، پژمُردہ دل دونوں بچھڑی ہوئی صورتیں آنکھوں کے سامنے آتا۔ وہ نوجوان شیر جن کو اپنے ہاتھ سے فنا کیا۔ عالمِ خیال میں سامنے آکھڑے ہوتے، ایک بجلی گرتی، ایک قیامت بپا ہوتی آنکھ سے آنسو گرتے، دل

میں ہوک اٹھتی، کلیجہ منہ کو آتا اور تڑپ کر رہ جاتی۔ سجدہ میں پڑی رو رہی تھی۔ اور زبان پر صرف یہ التجا تھی کہ معبود حقیقی اپنے حبیبؐ کے طفیل ایک دفعہ چھوٹے ہوئے لال خواب میں نظر آجائیں کہ عارفہ سوتے سوتے جاگ اٹھی۔ اور اس تکلف میں جو اسلام اور سلیمہ کے فراق میں آرہا تھا اس کیفیت میں جو اس وقت دل پر گذر رہی تھی۔ رخنہ پڑا۔ مضطرب ہو کر اٹھی۔ بچی کو تھپکا اور کوشش کی کہ جلد سُلا کر پھر اسی حالت میں منہمک ہو جاؤں۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ گود میں اٹھایا۔ لوری دی اور ٹہلی۔ بچی خاموش ہوئی تو بچوں کا فراق بدنصیب ماں کو پھر اسی میدان میں لے گیا۔ جانتی تھی اور اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور بہت اچھی طرح کہ جن پیاروں کو موت گہری نیند سُلا چکی۔ ان کی صورتیں اب نظر آنے والی نہیں۔ مگر ماں تا کا جوش اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور کھولا رہا تھا۔ رات چاندنی تھی اور شریفا اپنے بچے کے گلے میں ہاتھ ڈالے خاموش کھڑی تھی کہ وسیم دلہن کی نظر پڑی اور رو کر کہا:۔

"شریفا بس جا، خدا تیری ماں تا ٹھنڈی رکھے"

شریفا یہ سنتے ہی رو پڑی اور کہنے لگی:۔

"بیگم! میرا بچہ تم نے مجھ سے ملوایا۔ میرا منہ نہیں کہ شکریہ ادا کر سکوں میری ماں تا تمہیں دعائیں دے رہی ہے۔ اے بیگم! میری دعا دُکھے ہوئے دل سے نکل رہی ہے۔ خدا تمہارے دل کو صبر دے"

وسیم دلہن "تو اتنی دعا کر کہ میں اپنے بچھڑے ہوئے لال کو خواب میں دیکھ لوں۔ ہائے شریفا میں نے اسلام کے بدن پر بدھیاں دیکھیں! بید وں کے نشان اس کمر پر نہیں میرے کلیجہ پر اور جب تک زندہ ہوں باقی رہیں گے۔ اے شریفا! میرا بچہ اس سردی میں ہانپتا کانپتا گھر سے گیا اور مجھے چادر رہ تھی دینا نصیب نہ ہوا۔ ہائے شریفا! کیا کروں"

ابھی وسیم دلہن کے یہ الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ دروازے سے ایک آواز آئی۔

جس نے وسیم دلہن کو تڑپا دیا اور یہ کہتی ہوئی باہر آئی ۔

"اے شریفا! اسلام کی آواز ہے"

یہ عجیب وقت تھا۔ وسیم دلہن صحن میں کھڑی چیخ رہی تھی کہ دفعتاً برسوں کا بچھڑا ہوا لال۔ کلیجہ کا ٹکڑا۔ جوان شیر۔ اسلام گھر میں داخل ہوا اور ماں کے سینہ سے چمٹا۔ ایک چیخ ماری اور اتنا کہہ کر بیہوش ہو گئی ۔

"ارے کون! اسلام"

آناً فاناً سارا گھر آدمیوں سے بھر گیا۔ عارف اور بنتہن دونوں حیرت سے اسلام کا منہ تک رہے تھے۔ عارف نے کہا "یہ تار کیسا تھا جو تمہاری موت کے متعلق آیا تھا"۔ اسلام مسکرایا اور کہا "وہ ایک دوسرا اسلام تھا۔

وسیم دلہن اپنے بچہ پر پروانہ کی طرح قربان ہو رہی تھی کہ ایکا ایکی اس کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگی:۔

بے شک اماں جان کا مذہب سچا اور ان کا عقیدہ درست! خداوند حقیقی کی کل اپاہج مخلوق اور لاچار بندے مظلوم صورتوں میں دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ یا خدا اسما پر نہیں ان دلوں میں ہے۔ جن کی آہیں۔ عرش معلیٰ کی مالک ہیں۔ آج میں نے جب شریفا[1] میرے سامنے روئی اس کا بچہ اس سے ملوا دیا۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ زمین و آسمان کے حقیقی بادشاہ نے میرا مردہ لال زندہ کیا۔ اور مجھ سے ملوا دیا۔

(۱۹)

"ہاں، تو اس لئے کہ تمہاری ہوا ثریا کو نہ لگ جائے۔ تم نے اس کو کنجیاں دے دیں۔ صندوقچہ دیدیا۔ کہ وہ خود ہی کھول اور دوا نکال کر نہلے"۔

فاطمہ:۔ جی ہاں "۔

---

[1] نسیمہ

بلقیس "ہار اسی میں تھا"

فاطمہ "مگر چچی جان ثریا یا دش بخیر ایسی نہیں ہے اس پر کوئی اور شبہ کیجئے"

بلقیس "تم نے جب صندوقچہ احسان کو بھیجا تو ہار دیکھ لیا تھا"

فاطمہ "جی نہیں مجھے ڈر تھا کہ کہیں خدانخواستہ وہ اس بیماری میں نہ مبتلا ہو جائے"

بلقیس "ہار تم نے خود نہیں دیکھا۔ صندوقچہ میرے سامنے کھلا۔ رات کو ثریا دھونتال مینہ میں اس وقت تمہارے پاس آئی۔ جب یہ طے ہو چکا کہ اگر ہار فاطمہ کے پاس موجود ہے تو طلاق نہ ہو گی۔ آئی اور ہار کو اڑاو تا تم سے پوچھا اور تم نے اس کو کنجیاں دیں۔ دوسرے روز اس کے باپ نے ہار بھیجا تو کیا فرشتے لے گئے یا شیطان نے اڑا دیا۔ فاطمہ پیاری ساری دنیا کو اپنا جیسا نہ سمجھ!

تیری بیماری سے خوش ہو کر ثریا اور اس کے ماں باپ نے یہ کوشش کی کہ احسان کا نکاح اس سے ہو۔ فیصلہ ہار پر ٹھہرا وہ تیرے پاس آئی۔ ہار اڑایا اور بھیج دیا کہ ہم نے بازار سے لیا ہے۔ مگر ادھر احسان نے تجھے طلاق دی اُدھر اس نے ثریا کو بھی جواب دیدیا۔ میرے پاس جو پیام ثریا کی ماں کا آیا ہے۔ اس کا جواب میں بھیج رہی ہوں، وہ یہ ہے۔

ثریا جس سزا کی مستحق تھی وہ قدرت نے اس کو دی۔ اس نے ایک سیدھی سادی اور بھولی بھالی بچی کو دھوکا دیا۔ اور ایسا مکر، ایسا فریب، ایسا دھوکا جس کے خیال سے اذیت ہوتی ہے۔ اتنی خودغرضی، اس قدر نفس پروری اور اس درجہ نفسانیت خدا سے ڈرو اور مرنے کو مرنا سمجھو۔ تم لوگوں نے بے گناہ فاطمہ کو تباہ کرنے میں کسر نہ چھوڑی۔ تم نے وہ کیا جو کوئی نہ کرے گا۔ وہ کر گذریں جو کسی سے نہ ہو سکے گا۔ ایک بے گناہ بچی تمہارے ظلم کا شکار ہوئی۔ تم نے اس لڑکی سے جو خود تباہ ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر چھٹوایا۔ طلاق دلوائی اور جھوٹا بنوایا۔ وہ منہ سے اُف نہ کرے زبان

سے کچھ نہ کہے۔ اور تمہارے ساتھ کتنے ہی وارث، کتنے ہی طرفدار، کتنے ہی مددگار کیوں نہ ہوں۔ اس کا حمایتی انسان نہیں فرشتے اور کوئی طاقت نہیں، قدرت اور کوئی بندہ نہیں خدا ہے۔ میں تم جیسی عورت اور ثریا جیسی لڑکی کو کیا مدد دوں۔ تم یہ ہی غنیمت سمجھو کہ احسان تمہارے فریب میں نہ آیا۔ میں مسلمان ہوں اور میرا یقین میرا عقیدہ میرا ایمان یہ ہے کہ ثریا اپنے اعمال کی سزا اسی دنیا میں بھگتے گی۔ میری محترم بہن جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اور جو دم گزر جائے۔ خدا کا شکر کرو مگر یقین کر لو کہ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ ناکامی ختم نہیں ہوئی۔ ثریا نے ایک معصوم کو مل کر مارا۔ اور دوست بن کر تباہ کیا۔ اس کی آہ خالی جانے والی نہیں۔ تم سب کا کلیجہ توڑ دے گی۔ اور تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ ثریا در در کی ٹھوکریں کھائے گی۔ اور گھر گھر بھیک مانگے گی۔"

فاطمہ اللہ غنی، کس دل گردے کی بچی تھی کہ جب تک بلقیس نے اپنا خط پڑھا وہ چپکی کھڑی سنتی رہی۔ اور باوجود معلوم ہونے کے کہ اس کی تباہی و بربادی کا باعث ثریا تھی۔ اس کا دل اس وقت بھی محبت کے جوش سے خالی نہ تھا وہ بلقیس کی بددعا پر تڑپ اٹھی۔ آخری فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ اس نے بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "اچھی چچی جان یہ نہ فرمایئے۔ ثریا بے وقوف ہے۔ غلطی ہو گئی۔"

بلقیس کا غصہ فاطمہ کے اس تحمل سے اور بھڑکا۔ وہ کہنے لگی:۔

"فاطمہ! یہ قدرت کے انتظام ہیں۔ جو میرے اور تیرے اختیار سے باہر ہیں اگر میں زندہ رہی تو دکھا دوں گی۔ میں اس کے اور اس کے ماں باپ کے منہ پر کہہ چکی ہوں۔ احسان ایسا تاراج ہوگا کہ دنیا اس کی صورت سے پناہ مانگے گی اس نے قیامت ڈھائی ہے۔ حشر بپا کیا ہے اور ایک ایسے پھول کو قدموں سے روندا ہے۔ جس کی خوشبو سے عرش معلیٰ معطر ہے۔"

بلقیس اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ فاطمہ اس کے قدموں میں گر پڑی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"رحم! چچی جان! بدنصیب ہوں۔ مصیبت ماری ہوں! ترس کھائیے میرا دل زہیر ہے۔ میں رحم کی مستحق ہوں۔ احسان کو برا نہ کہئے! آج نہ سہی وہ کبھی میرا تھا۔ چچی جان احسان اس وقت نہ ہو۔ مگر میرا رہ چکا ہے۔ اس نے میرے دل پر راج کیا ہے۔ اس کی محبت کے پھول میرے دل پر کھلے ہیں۔ آج گو مرجھا گئے ابھی اُن کی پنکھڑیاں اور پنکھڑیوں کی خوشبو میرے سینہ میں موجود ہے۔ وہ جس کا ہو۔ خدا اُسے نصیب کرے مگر اس دنیا میں وہ لمحہ گزرا ہے۔ جب وہ میرا تھا اور میں اس کی تھی۔ چچی جان جلسہ ختم ہو گیا لیکن اس کی یاد ابھی باقی ہے۔ محفل شب ختم ہوتی مگر بچھڑنے والی صورتوں کے نقشے ابھی آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ وہ سماں برہم گیا۔ لیکن اس کا اثر ابھی موجود ہے۔ خدا مجھے زندہ نہ رکھے اس وقت کہ میں احسان کی تکلیف سُنوں۔ اس کی اذیت دیکھوں۔ میرے کان ٹوٹ جائیں۔ میری آنکھیں پھوٹ جائیں اس سے پہلے کہ میں احسان کی کوئی پریشانی دیکھوں یا سنوں۔ آپ میری محسن ہیں لیکن چچی جان قدموں میں سر ہے۔ رحم، کرم، وہ خوش رہے اور زندہ رہے"

ڈاکیہ کی اس آواز نے کہ "خط لے جاؤ" اس منظر کا خاتمہ کیا۔

فاطمہ خط لائی تو احسان کا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ دل تڑپنے لگا اور باوجود اس تمام گفتگو کے چہرہ پر مسکراہٹ آ گئی۔ کھولا، پڑھا۔ کچھ سوچا اور کہنے لگی "

"سچ ہے، بے شک سچ ہے"

بلقیس "کیا لکھا ہے؟"

فاطمہ "یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ تم نے میرا ہار بیچ کر یا گروی رکھ کر الّلے تلّلے شروع کر دیئے مگر تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میرا تمہارا تعلق

منقطع ہوا تو ہار کی، ایسی تمہاری ذات پر فرض ہے۔ یہ اب تو بہت زیادہ کا ہے۔ مگر دو ہزار روپے کا خریدا گیا۔ سُن رہا ہوں تمہارے ہاں روپیہ کی ریل پیل ہے۔ ہمارا روپیہ جس قدر جلد ممکن ہو ادا کر دو۔"

بلقیس اس کے جواب میں کچھ نہ بولی، اس کا سر چکرا گیا۔ اور غصہ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ آگے بڑھی اور چلنے لگی۔ دروازہ میں پہونچ کر صرف اتنا کہا:۔

"دونوں عورتیں یہاں روز سوتی ہیں؟"

فاطمہ نے اس سوال پر جی کا شکریہ ادا کیا۔ اور بعد منت ایک پوٹلی اس کو دی اور کہا۔ آپ نے سُن لیا ہوگا۔ سالانہ نمائش میں میرے میز پوش پر دو ہزار روپیہ انعام ملا ہے۔ ہزار روپے احسان کو دیجئے۔ اور آپ نے اس موقع پر جو کچھ عنایت فرمایا تھا۔ وہ ضرور لے لیجئے۔"

بلقیس پر اس وقت دو متضاد کیفیتیں گذر رہی تھیں ادھر وہ آپے سے باہر تھی، اور چاہتی تھی کہ احسان سامنے آئے تو منہ نوچ لوں۔ ادھر فاطمہ کا ایثار اس کے ٹکڑے اڑا رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ کس طرح اس انسانی حور کو دل میں بٹھالوں۔ گاڑی تیار تھی۔ چپ چاپ باہر نکلی۔ اور روانہ ہوئی۔ گھر پہونچی۔ پوٹلی ہاتھ میں تھی کہ احسان نظر آیا۔ اور کہنے لگا :۔

"نہ معلوم فاطمہ نے آپ پر کیا جادو کر دیا۔ ابھی تک تو آپ اس کا کلمہ ہی پڑھتی تھیں۔ اب رہنا سہنا بھی وہیں کا ہوگیا۔ دوپہر سے میں اور اماں جان دونوں آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

بلقیس "کہو، میاں کیا کام ہے؟"

احسان کی ماں توقیر آگے بڑھی اور کہا:۔

"بیوی اس وقت خاندان کی لاج تمہارے ہاتھ ہے پہلے بھی کئی مرتبہ میں

نے کہا۔ احسان نے کہا۔ اس کے باپ نے کہا۔ تم سے کہا۔ تمہارے ابا جان سے کہا۔ بھائی سے کہا۔ اور اب پھر کہتی ہوں۔ منت خوشامد سے کہتی ہوں اور ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ " احسان کو اپنی غلامی میں قبول کر دو۔"

بلقیس:۔ خاندان کی جو ناک کٹنی تھی۔ وہ کٹ چکی۔ اب کیسی آن اور کس کی لاج احسان نے تمہاری صلاح اور باپ کے مشورے سے وہ کیا کہ بزرگوں کی ہڈیاں بھی قبر میں تھرا گئی ہونگی۔ ذلیل سے ذلیل خاندان، کمینہ سے کمینہ کنبے، اور بدتر سے بدتر لوگوں میں بھی اس کی مثال نہ ملے گی۔ کیا اب بھی تم کو یہ حق ہے کہ احسان کا پیام کسی دوسری جگہ دو۔ تمہارا منہ اس قابل اور تمہاری صورت اس لائق نہ رہی۔ تم نے دنیا کو خود غرضی اور نفسانیت کے وہ نمونے دکھائے ہیں کہ مسلمان تمہارے نام سے کانوں پر ہاتھ دھریں گے۔ ماں باپ بیٹیوں کو کنوئیں میں پھینک دیں گے؛ زندہ دفن کر دیں گے۔ مگر تمہارا رخ نہ کریں گے۔ تم نے نکاح نہیں احکام شرعی کو ٹھکرایا۔ تم نے خدا اور اس کے رسولؐ سے رد گردانی کی۔ تم نے انسانیت کو پامال کیا۔ اور اب بیٹی مانگنے کے لئے تیار ہو! اور اس جفا شعار اس بے وفا احسان کے واسطے۔ جس کی سنگدلی اور سرد مہری کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ تو قیر بہن گریبان میں منہ ڈالو اور وہ وقت یاد کرو۔ جب احسان (اس کی جان سے دور) دم توڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ باپ اور ماں دونوں ٹکریں مار رہے تھے۔ اور آج تم جو اس کی شادی رچا رہی ہو۔ اس کی موت کا یقین کر چکی تھیں۔ جن ہاتھوں سے آج چوتھی کا جوڑا تیار ہوگا یہ کفن کے واسطے دراز ہو چکے تھے۔ موت تمہارے گھر پر منڈلا رہی تھی اور وہ وقت آن پہنچا تھا کہ ایک نوجوان جنازہ تمہارے صحن میں رکھا ہو۔ جب نظام عالم نے تمہیں یہ سماں دکھایا اور دنیا تمہاری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ تو یہ وہ وقت تھا

کہ تمہارے عزیز واقارب، تمہارے نوکر چاکر، تمہارا شوہر اور اولاد سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور احسان کی موت (خاکم بدہن) تمہارے سر پر آ براجی۔ تم بھول جاؤ مگر مجھ کو وہ ساعت یاد ہے۔ اور وہ رات میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ جس کی صبح تمہارے لال کا خاتمہ کر رہی تھی۔ کہ عین اس وقت جب ایک زبردست طاقت کے سوا دنیا کا ہر ذرہ عالم خواب میں تھا۔ وہ ہستی نمودار ہوئی۔ جس نے تمہارے بچہ کی موت اپنے سر پر لی۔ تمہاری آگ میں کودی اور تمہارے لال پر قربان ہوئی اور اس طرح کہ آج اس کا راز جاننے والا دو تین کے سوا کوئی نہیں میں نے تم لوگوں کو بتا اور دکھا دیا کہ یہ نثار ہونے والی فاطمہ ہے جس کی گردن سے خون ٹپک رہا ہے۔ بہن توقیر ذرا اس کمرے میں جاؤ اور دیکھو تمہاری شرقی دیوار اس وقت اس کے خون کی چھینٹیں آغوش میں لئے کھڑی ہے۔ کیوں۔ توقیر اس کے ایثار اور اس کی قربانی کا یہی حق تھا۔ جو تم نے ادا کیا۔ تمہارے بچے نے جائز اور تمہارے شوہر نے روا رکھا! توقیر زمین پھٹ جاتی۔ آسمان ٹوٹ پڑتا تم، میں، تمہارے اور میرے شوہر اور بچے سب فنا ہو جاتے۔ خاندان کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور ہم تباہ و برباد ہو جاتے۔ اس سے پہلے کہ تم احسان اور اس کا باپ فاطمہ سے دغا کرتے توقیر تم یہ دیکھ کر نہ تھرائیں۔ اور میں کہتی ہوئی کانپ رہی ہوں۔ اس نے احسان کے نکاح میں تمہارے بچے پر قربان ہو کر ہفتے کے فاقے کئے اور زبان سے اف نہ کی!! تمہیں معلوم ہے اور مجھ سے زیادہ کہ جب اس کی صورت بگڑ گئی اور وہ کسی سے ملنے کے قابل نہ رہی۔ اس کی زبان پر احسان کا کلمہ تھا۔ توقیر میں نے اپنی آنکھوں سے اس چاند کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ ایک پھٹی سی گدڑی اور ٹوٹے ہوئے جھلنگے میں تنہا پڑی ہوئی احسان کا نام رٹ رہی ہے! اگر ایمان تمہارے شوہر کے۔ یا تمہارے بچے کے ساتھ ہوتا۔

تو ہم اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے، تم اس کے خون کا ہر قطرہ اپنی آنکھوں سے ملتیں۔ تمہارا شوہر اس کے دکھ پر اپنا سُکھ اور اس کی مصیبت پر اپنی راحت قربان کرتا۔ احسان پروانہ کی طرح اس شمع پر نثار ہوتا۔ توقیر! وہ غیر نہ تھی۔ اسی تھان کا ٹکڑا اور اسی خاندان کی لاج۔ اس کا نکاح کچا دھاگا نہ تھا۔ وہ تم سب کی محسن تھی۔ اور گو تم سب آج ہشاش بشاش ہو مگر تمہاری گردنیں اس کے احسان سے دبی ہوئی ہیں۔ تم کو اب تک معلوم نہ تھا۔ مگر اب دیکھو کہ اس پھول کی خوشبو نے ایک دُنیا کو اُس چاند کی چمک نے ایک جہان کو جھکا اور چمکا رکھا ہے۔ توقیر! وہ تو صرف ایک آزمائش کا وقت تھا۔ اس کی مصیبت مستقل نہ تھی۔ ایک جلیل القدر طاقت ہم سب کو ایمان کی کسوٹی پر پرکھ رہی تھی وہ آج صورت اور سیرت دونوں جوہروں سے مالا مال ہے۔ اس نے دو ہی سال کے عرصہ میں اپنی دستکاری سے اتنا پیدا کر لیا کہ ایک دو نہیں بیسیوں اللہ کے بندے اس کے دستر خوان سے پیٹ بھر رہے ہیں۔ تمہارے ظلم سے ایک نہیں سات آسمان کانپ رہے ہیں۔ تم کو خوب معلوم ہے کہ تمہارا ہار تنزیلہ نے چرایا۔ مگر لعنت تم پر اور احسان پر اور افسوس صد افسوس تمہارے شوہر پر کہ آج اس بے پروائی سے جب اُس کے باپ کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں۔ ہار کا روپیہ مانگنے ہو۔ الامان، الحفیظ! اس کا باپ تمہارا بھائی۔ اس کی ماں تمہاری بھاوج، اور وہ خود تمہاری بھتیجی۔ لو یہ روپیہ لو گو مجھے واپس لینے کی ضرورت نہیں مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ یتیم اور بے کس بچی نے رات دن سوئی مار کر یہ روپیہ پیدا کیا ہے۔ جو تم نے وصول کیا۔ اپنا تموّل اور اُس کی حالت سامنے رکھ کر اس کی شرافت پر غور کرو کہ تمہارے آدھے سخن پر روپیہ نکال حوالے کیا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں نے عمر بھر جھوٹ نہیں بولا۔ میرا دل کٹ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ فاطمہ صرف اس خیال سے خوش تھی کہ میری

کمائی احسان کے کام آئی۔ میں اور تم اس کی طبیعت سے واقف اور اس کی عادت سے آشنا ہیں۔ اب اگر دنیا بھر کی کوشش کریں تو وہ روپیہ واپس لینے والی نہیں۔ لیکن جزاک اللہ جزاک اللہ! احسان میاں! تمہارا خط اس نے ہنس ہنس کر پڑھا اور روپیہ خوش ہو ہو کر دیئے۔ تمہاری درخواست کا جواب یہ ہے کہ بہتر سمجھتی ہوں کہ اپنی بچی حسینہ کو تم سب کے سامنے اپنے ہاتھ سے زہر دے کر پیوند زمین کر دوں۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی بیٹی تمہارے سپرد کروں۔

پیاری بہن توقیر اور کلیجہ کے ٹکڑے احسان جس پھول کو تم نے اس بے دردی سے مسلا اس کی پتیاں مرجھا کر رنگ لائیں گی اور جس فاطمہ کو تم لوگوں نے اس سرد مہری اور سنگ دلی سے دھتکارا وہ اسی حسین منزل میں راج کرے گی۔ اور میں اس وقت کہے دیتی ہوں کہ میرا بچہ حفیظ جو ڈاکٹری میں کامیاب ہو کر ۲۱- تاریخ کو ولایت سے آرہا ہے۔ اگر میرے اس گوشت اور خون کا ٹکڑا ہے۔ اگر میرے دودھ کا اس پر کوئی حق ہے تو فاطمہ کی چوکھٹ کو سجدہ کرے گا اور میں اس کو اپنے سر آنکھوں پر دلھن بنا کر اس گھر میں لاؤں گی۔ میں نے آج جو عمل اس کا دیکھا۔ زبان سے کہنا نہیں چاہتی مگر میرے دل نے فیصلہ کر لیا کہ خوش نصیب ہوگا۔ وہ شوہر جس کے نکاح میں فاطمہ ہو اور خوش نصیب اس ماں اور اس باپ کے جو اس کو بیاہ کر لائے۔

میں اس وقت علی الاعلان تمام خاندان کے سامنے ہانکے پکارے اور ڈنکے کی چوٹ کہتی ہوں کہ فاطمہ میری ہو چکی۔ یہ میری چھنگلیا دیکھو ستائیس سال بعد آج خالی ہوئی ہے۔ اور یہی ہیرے کی انگوٹھی جو خدا غریق رحمت کرے اماں جان نے مجھے چڑھائی تھی۔ آج اپنی دلھن کو حفیظ کے نکاح کا نشان چڑھا آئی۔

میری عزیز بہن! خدا تمہاری مامتا ٹھنڈی رکھے اور تمہیں اس کی بہاریں دیکھنی نصیب ہوں۔ یہ جو کچھ کہا دل کی بھڑاس اور کیفیت کا اظہار تھا۔ ناگوار ہو تو معاف کرنا۔ میری دلی آرزو ہے کہ خدا تم سب کا انجام بخیر کرے۔ اب تم بھی سچے دل سے دعا کرو کہ معبود حقیقی اپنے حبیب کے طفیل حفیظ کی صورت مجھ کو دکھائے اور میں دونوں دولھا دلھن کو ہنسی خوشی اور زندہ سلامت چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوں۔"

مرے توقیر اور احسان دونوں کی ماں اگر ایک لفظ بھی بلقیس کے جواب میں زبان سے نکالا ہو۔ آگے آگے ماں اور پیچھے پیچھے بیٹا۔ چپ چاپ سیدھے ہو لئے۔ کچھ دیر تک مشورہ ہوتا رہا۔ اور دوسرے روز احسان کا نکاح ثریا سے ہوا اور اس دھوم دھام سے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

(۱۹)

کس کی زبان میں طاقت اور قلم میں ہمت ہے کہ اس حالت کو بیان کر سکے جو سلیم دلھن کی اسلام کو گلے لگا کر ہوئی وہ پہلی دیوانگی میں ہشیار تھی مگر آج ہشیاری میں دیوانوں سے بدتر تھی۔ نگاہ ہر وقت آسمان پر تھی۔ زبان سے کہتی، دل میں کہتی، آنکھ سے کہتی، چیخ کر کہتی۔ خاموشی سے کہتی کہ:-

"ہاں ہاں تیری قدرت سچی! تیری حکومت اچھی!"

مردہ اسلام کا زندہ ماں سے مل جانا دنیا کے نزدیک اور (بزعم خود تعلیم یافتہ) مسلمانوں کی رائے میں اتفاق سہی۔ مگر ہم اس کو شریفاً ہی کی دعا کہیں گے۔ اور اپنا خیال ختم نہ کریں گے کہیں گے۔ اور اعلی ذوس الاشہاد کیسی منطق کیسا فلسفہ، کس کی سائنس، یہ قدرت کے کرشمے ہیں۔ عقل دنگ قیاس ساکت اور رائے ناقص ہو جاتی ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ سلیم کی خبر موت کمبخت ماں کے کان تک پہنچ چکی اور جس طرح وہ

اسلام کے واسطے صرف اتنی خواستگار تھی کہ ایک دفعہ خواب میں صورت دیکھ لوں اسیطرح اب اگر اس کی خوشی میں کوئی کانٹا کھٹک رہا تھا۔ تو وہ سلیم کی آرزوئے دید اور وہ بھی خواب میں۔ وہ سلیم کی ایک جھلک کے واسطے جس وقت خیال آجاتا گھنٹوں دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتی۔

ایک روز دوپہر کے وقت وہ اسی حالتِ اضطراب میں تن تنہا چھت پر ٹہل رہی تھی۔ کہ برابر کے گھر سے غل غپارہ کی آواز آئی۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ تو مکاندار ہمسایہ کو گھر سے نکال رہا تھا۔ برتن بھانڈا سب پھینک دیا تھا۔ کچھ آدمی اور بھی جمع ہو گئے تھے مگر یہ سب ساکت وخاموش تھے کہ ہمسائی پر سات مہینہ کا کرایہ چڑھا ہوا تھا۔ ہمسائی اور اور اس کی کواری بچی دونوں سلائی پر گذارا کرتی تھیں۔ اور کام کا مندا ہونے کی حالت میں پیٹ ہی بھرنے کے لالے تھے۔ کرایہ کیوں کر ادا ہوتا۔ ہمسائی کا شوہر تھا تو کسی انگریز کا چپراسی، مگر نصیر آباد کے شاہی پیرزادوں میں سے تھا۔ جو ساداتِ بلگرام سے بھی دو قدم آگے ہی تھے۔ پیرجی کو مرے چوتھا سال تھا۔ بچی اب خاصی سولہ سترہ برس کی تھی۔ دو پیام اس کے سامنے اور ایک اس کے بعد۔ شادی کے آئے۔ مگر صرف اس لئے نامنظور ہوئے کہ ذات میں خرابی تھی۔ بدبخت ماں نے جو پیام نامنظور کیا وہ لڑکا پچاس روپیہ کا نوکر تھا۔ اس کا نقص صرف یہ ٹھہرا کہ دادا کے چچازاد بھائی کے بہنوئی نومسلم تھے۔ خاندان میں اعزاز کا لحاظ فقیر مسلمانوں کو بہت زیادہ رہتا ہے۔ اور مجبور اس کے لئے کہ ما بہ الامتیاز ایک یہی جوہر یا لغویت ہو سکتی ہے۔ اور اس کے پیش کرنے میں ہلدی پھٹکری کچھ نہیں لگتی۔ مگر کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ اسلام کا فیصلہ تو یہ ہو کہ ممتاز ہے۔ وہ جو متقی ہے مگر مسلمان شیخ وسید کے نشہ میں بدمست ہیں۔ اسی نشہ کا شکار بی ہمسائی ہوئیں۔ وہ بزعم خود خاندان کے ایسے جواہرات سے مالا مال تھیں۔ جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی نعمت کر ہی نہ سکتی تھی۔ اس بے وقوفی کا نتیجہ جو ہو سکتا تھا۔ وہ ہوا کہ دونوں ماں بیٹیاں سخت تکلیف بھگت رہی تھیں۔ بایں ہمہ بیوہ اور یتیم لڑکی مسلمانوں کی ہمدردی اور اعانت کی مستحق تھی۔

مگر مسلمانوں کا وہ گروہ جو موجود تھا اطمینان سے انقلاب کی ان دو تصویروں کا ہنس ہنس کر تماشہ دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ مکان دار کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"اب بھی اگر تم دونوں اپنے بوریئے بدھنے کو اٹھا کر باہر نہ نکلو گی تو میں ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔"

مسلمانوں کے تماشہ میں اس ایک منظر کا اور اضافہ ہوا۔ کاٹ کباڑ سڑک پر پھکا پڑا ہوا تھا۔ کچھ مٹی کے ٹوٹے برتن تھے۔ دو ایک جھلنگے تھے اور ایک آدھ پھٹی پھٹائی دری، رضائی بھی تھی کہ مکان دار کی نظر لڑکی کے ہاتھوں کی طرف پڑی اور کہنے لگا۔ "یہ غضب دیکھئے۔ لڑکی کو زیور پہنا رکھا ہے۔ اور دوسری کی رقم دبالی ہے یہ چاندی کی چوڑیاں دس روپے سے کم نہیں ہیں۔ دیئے کا پاپ دیئے سے کٹتا ہے لاؤ یہی دو۔ کچھ تو میرے آنسو پچھیں۔"

ہمسائی "یہ چوڑیاں اس کے باپ کے زمانہ کی ہیں۔ اور میری نہیں اس کی ہیں۔ میں نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی اس کا دھیان نہیں کیا۔ یہ جس دن سے اس کے ہاتھ میں پڑی ہیں۔ اس وقت تک نہیں اتریں۔ فاقہ بھی ہوئے ننگی بھی ہوئی۔ تم بھی بیٹیاں رکھتے ہو۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔ اگر میں اس کو کچھ نہیں دے سکتی تو کیا اس کا بھی کھا جاؤں۔"

مکاندار "مجھے اپنی رقم سے کام ہے۔ ان باتوں سے کیا واسطہ، نہیں اتریں تو اب اتریں گی۔ آپ تو زیور رکھو اور دوسروں کو پریشان کرو۔ کیا میں مفت مانگ رہا ہوں۔ خوشی سے اتار دو، نہیں میں اتارے لیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر مکان دار نے تماشائیوں کی طرف دیکھا اور کہا "کیوں صاحب میں جھوٹ تو نہیں کہتا۔ میرا کرایہ دو اور جدھر منہ اٹھے چلے جاؤ۔ میرا مکان خالی کرو۔ نہ ہوتا تو میں چپکا ہو جاتا۔ مجھ کو بھی آخر دو ہی گے جب مجھ کو دو اس وقت

لڑکی کی چوڑیاں بنوا دینا۔ میں کیوں اتنے دن صبر کروں"۔

سُننے والوں نے مکاندار کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہمسائی سے کہا:۔

"بے چارہ سچ تو کہتا ہے۔ دوسروں کی رقم کیوں مارو۔ چوڑیاں اس کے حوالہ کرو جب اللہ دے پھر بنوا لینا"۔

اب مکان دار شیر ہو گیا اور آگے بڑھ کر کہا:۔

"لا لڑکی کی چوڑیاں اتار دے۔ اور نہیں میں آپ اُتار لوں گا"۔

یہ واقعہ تھا کہ چوڑیاں لڑکی کی ملکیت تھیں۔ اور گو وہ ماں پر قربان کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس وقت آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ یہ میرے باپ کی نشانی ہیں۔ کس محبت، شفقت سے خود سنار کی دوکان پر بیٹھ کر بنوا کر لائے اور میرے ہاتھوں میں پہنائیں باپ کی محبت اور اس کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی آنسو ہماری ہو گئی اور وہ سماں یاد آ گیا۔ جب باپ نے شفقت پدری کی یہ یادگار ہاتھوں میں ڈالی اور کہا۔ "یہ چاندی کی ہیں۔ اگر زندہ رہا تو سونے کی بنوا دوں گا"۔

اس کی زبان ساکت تھی۔ مگر اس کا دل مکاندار سے کچھ التجا کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ فطری طور پر سکڑا۔ وہ جانتی تھی۔۔ اس لئے نہیں کہ چوڑیاں اتر رہی تھیں بلکہ اس لئے کہ ایک نامحرم عنقریب میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اس کے دونوں ہاتھ برقع میں چلے گئے۔ ہاتھ ابھی پوری طرح نہ گئے تھے کہ یہ کہہ کر مکان والے نے ہاتھ آگے بڑھایا "چوڑیاں چھپلنے نہ دوں گا۔ سب نے دیکھ لی ہیں"۔

حمیت اسلامی فنا ہو رہی تھی کہ ایک جوان مسلمان لڑکی کا ہاتھ صرف چند سکوں کی طلب میں ایک نامحرم شخص کے ہاتھ میں مسلمانوں کے سامنے تھا۔ لڑکی نے رو کر کہا۔

"آپ لوگ چوڑیاں لے لیجئے مگر میرا ہاتھ چھڑوا دیجئے"۔

اس وقت ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ ایک لاوارث مسلمان لڑکی کا ہاتھ

صرف چند روپوں کے واسطے ایک غیر محرم سنگ دل مسلمان کے ہاتھ میں تھا اور بیسیوں مسلمان آنکھیں دیکھ رہی تھیں! وہ کانپ رہی تھی اور ہر طرف اس توقع پر دیکھ رہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ میرا ہاتھ چھٹوا دے اور مجھ کو صرف اتنی مہلت دے کہ میں یہ چوڑیاں، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اتار کر اس کے حوالہ کر دوں۔

یہ دردناک کیفیت تماشائیوں کے سامنے چند لمحہ رہی اور جب لڑکی کی مایوس آنکھیں یقین کر چکیں کہ کوئی متنفس مجھ کو اس ظلم کے پنجہ سے بچانے والا نہیں تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:-

"میرا ہاتھ چھوڑ دو، چوڑیاں آتارتی ہوں"

اس کے بعد ایک آواز ہوا میں گونجی۔ اور کہا:-

"ہاں ٹھیک ہے۔ چھوڑ دو کہ چوڑیاں اتار دے"

قرض خواہ کی نظریں مڑیں۔ جو ہر کوشش کے بعد تماشائیوں سے داد کی متوقع تھیں۔ کسی کی گردن کے اشارے سے کسی کی آنکھ کی گردش سے اس کو داد ملجاتی تھی۔ کہ لڑکی نے پھر الفاظ دہرائے اور کہا:-

"آپ لوگوں کے سامنے سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی، میرا ہاتھ چھٹوا دیجئے۔ میں چوڑیاں اتار دیتی ہوں"

کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اور حاضرین منظر کیا کرتے کہ دفعتہً ایک انسانی ہستی برقع میں لپٹی ہوئی قرض خواہ کے ہاتھ پر بجلی کی طرح گری اور کہا یہ صحیح کہ تیرا کرایہ واجب ہے۔ مگر تجھ کو کیا حق ہے کہ ایک پردہ نشین لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو اپنی آنکھ سے یہ سماں دیکھیں اور خاموش ہو جائیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ ایک چشم زدن میں جب قہر خدا نازل ہوا۔ پردہ کی نہیں محلوں کی بیٹھنے والیاں گلیوں میں خاک چھاننے لگیں۔ جو آنکھیں ایک پردہ نشین بچی کا تماشہ دیکھ رہی ہیں اس

کے لیئے بھی تیار رہیں کہ اپنی پردہ والیوں کو بھی اسی رنگ میں دیکھیں گی "۔
"بیوی تو اندر جا! اور لے اے سنگ دل اپنا کیا یہ"
لڑکی یہ دیکھ کر کہ ایک فرشتہ غیبی نے میری حمایت کی سناٹے میں رہ گئی۔
قرض خواہ کرلیے کر باہر نکلا۔ تماشائی رخصت ہوئے دونوں ماں بیٹیاں
نسیمہ کی بہو وسیم دلھن کے قدموں میں گر پڑیں۔ وسیم دلہن نے ان کو
اٹھا کر گلے سے لگایا اور صرف اتنا کہا "یہ احسان نہیں انسانیت ہے"
گھر آئی اور نہ معلوم کس خیال میں غرق خاموش کھڑی تھی کہ سامنے سے عارف
آیا اور کہا۔ "بیگم! سلیم کی خبر موت بھی غلط تھی۔ یہ لو وہ آگیا"
آناً فاناً تمام گھر عورتوں سے بھر گیا اور ہر سمت مبارک سلامت کی دھوم دھام
ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ماں جس بچہ کو مُردہ سمجھ کر دیوانوں کی طرح
پھر رہی تھی وہ ماں کے سینہ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ چیخیں مار کر رو رہی تھی کہ دفعتہً اس کو
کچھ خیال آیا اُس نے بچہ کو ہٹایا۔ آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "تیری شان تجھی کو سزاوار ہے"

(۲۱)

نماز جمعہ کے بعد اس لیئے کہ اعلان ہو چکا تھا۔ ہزاروں مرد اور عورتیں فاطمہ کے
مکان پر جمع ہوئے۔ گی آدمیوں سے پٹی پڑی تھی۔ اس میں دوست احباب بھی تھے
تماشائی اور سیلانی بھی کہ برات کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ جب پالکی دروازے پر پہنچی
تو بلقیس برقعہ اوڑھے باہر نکلی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بچے حفیظ کو جو
دولہا بنا ہوا تھا گلے سے لگا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور پھر آواز بلند کہا :-
"شادیاں اس دنیا میں رات دن ہوتی ہیں۔ ہو رہی ہیں۔ اور ہوں گی۔ مگر
جو نکاح اس وقت ہو رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تاریخ میں بے مثل ہوگا۔ یہ اس بچی
کا نکاح ہے۔ جس کے سر پر خدا کے سوا کوئی وارث نہیں! یہ اسی بچی کا نکاح ہے جسکو

دنیا فقیر اور حقیر سمجھ کر دھتکار چکی! یہ وہ بچی ہے جس کا آج سے پانچ سال قبل میرے عزیز بھتیجے احسان سے نکاح ہوا۔ مگر جب دورِ حیات یعنی انقلابِ دنیا نے اس بچی کے سر سے باپ کا سایہ اٹھا دیا۔ اور یہ فانی دولت، جس کے آج ہم دلدادہ ہیں اس کے پاس نہ رہی تو شوہر اور اس کے متعلقین نے اس معصوم ہستی کو ٹھکرا دیا احسان کا یہ فعل ایسا نہ تھا کہ قدرت خاموش رہتی۔ اس ظلم کی سزا وہ پھوڑا تھا جس نے احسان کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ اور وہ نازک وقت آیا کہ ڈاکٹر اور وید، حکیم اور طبیب سب جواب دے چکے۔ اور مریض کی زندگی ایک جوان اور تندرست آدمی کی گردن کا خون قرار پایا۔ مسلمانوں یہ وہ وقت تھا کہ معصوم فاطمہ حسنین منزل سے تاراج ہو کر اس محلہ میں آباد ہوئی۔ اس کو اس کی ماں کو گھر سے نکالنے والے وہی افراد ہیں جو آج حسنین منزل کے مالک اور اس میں آباد ہیں۔ فاطمہ کی ماں زلیخا خدا غریق رحمت کرے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض کمزوریاں رکھتی تھیں مگر حسنین منزل نے جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا۔ وہ دامنِ انسانیت پر بدنما دھبہ ہے یہ وہ ساعت ہے کہ احسان اور اُس کے ماں باپ جنھوں نے معصوم جذبات اور بے گناہ بچی کو کتے کی طرح دھتکارا۔ اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ موت کا ابرِ سیاہ آسمان حیات پر نمودار ہو چکا ہے۔ اور بچہ کے فراقِ ابدی کی مجسم تصویر کمرے کے چپہ چپہ سے اپنی خوفناک صورت دکھا رہی ہے۔ اور ٹھیک آدھی رات کے وقت جب ماں اور باپ دونوں مُردہ بن چکے تھے۔ حسینی فلک کا وہ چاند جو اس گھر میں چمک رہا ہے۔ بدنصیب مریض اور مایوس ماں باپ کی اعانت کو آگے بڑھا۔ آج جس بچی کا نکاح ہو رہا ہے۔ یہ وہی فاطمہ ہے۔ جو شوہر کے سرہانے کھڑے ہو۔ اس پر قربان ہوئی!! اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھری پھیری۔ اور تازہ خون مریض کی نذر کیا۔ میں نے اپنی آنکھ سے وفا کی اس دیوی کو عصمت کی

اس تصویر اور اسلام کے اس نمونہ کو دیکھا کہ یہ اسی کٹی ہوئی گردن کو لیئے کمرہ سے باہر چلی۔ میں نے احسان کو دکھایا۔ اس کے والدین کو دکھا کر کہا۔ جس فاطمہ کو تم نے اس گھر سے نکالا وہ رات کے اس سناٹے میں تمہارے بچہ پر نثار ہو گئی!!

عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بتلائے کہ احسان اور اس کے ماں باپ اس کے بعد فاطمہ کے ساتھ کیا کریں گے۔ خیال یہ تھا اور خیال کیا یقین کہ بے وارثی بچی شوہر پر قربان ہو کر قبر میں پہونچی۔ اور اس دنیا کو دکھا گئی کہ عورت کا دل کیسے بیش بہا جذبات سے مالامال ہے! خدائے برحق کو ابھی اس پھول کی اور آزمائش منظور تھی۔ موت مصیبت سے بدلی اور لوہے کے زہر نے تمام جسم برباد کر دیا۔ میری آنکھیں وہ سماں دیکھ چکی ہیں جس کو بیان کرنے میں میری ہچکی بندھ جائے گی۔ اس نذر کا معاوضہ شہید بیوی کو طلاق تھی۔ اور صرف اس لیئے کہ اس کی صورت بگڑ گئی، اور افلاس چھا گیا جب احسان اور اس کے ماں باپ کے ہاتھوں فاطمہ تباہ و برباد ہو چکی تو وہ سچا حمایتی جس نے ابراھیمؑ کو آگ کے شعلوں میں مدد دی۔ اس کی حفاظت کو کھڑا ہوا۔ اور آج اس کی صورت وہ پھول ہے۔ جس کو بقائے دوام کی خوشبو میسر ہے۔

میں آج آپ سب کے سامنے اپنے بچّہ کو حکم دیتی ہوں کہ قبل از نکاح اس چوکھٹ کو بوسہ دے۔ جس میں یہ چودھیں رات کا چاند اپنی چمک سے دنیا کو منور کر رہا ہے!

اتنا سنتے ہی حفیظ آگے بڑھا۔ اور اس نے فاطمہ کی چوکھٹ کو ماں کے حکم سے بوسہ دیا۔

ابھی وہ اٹھنے نہ پایا تھا کہ بلقیس بے تابانہ آگے بڑھی۔ اس نے حفیظ کو پاس بلایا سینہ سے چمٹایا اور کہا:-

"خدا عمر دراز کرے۔ حفیظ! میں نے چمنستانِ دنیا میں وہ پھول چنا ہے۔

جس کی خوشبو کبھی فنا نہ ہو گی "

نکاح پڑھایا گیا ہے۔ بلقیس اور اس کے ساتھ سینکڑوں عورتیں اندر گئیں بلقیس نے دلھن کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے اور کہنے لگی۔

- بیگم! تو حق رکھتی ہے کہ ہاتھ نہیں، تیرے قدم، اور میں نہیں دنیا اپنی آنکھوں سے لگائے "

دلھن پالکی میں بیٹھی اور بلقیس راستہ بھر اشرفیاں نثار کرتی ہوئی فاطمہ کو بہو بنا کر لائی۔

(۲۲)

تاج داران مغلیہ کا وہ درویش صفت بادشاہ جس کی آنکھیں انقلاب کے دردانگیز منظر سے دوچار ہوئیں جس کو جوان بیٹے کا خون آلود سرخوان میں دیکھنا پڑا۔ فرماتا ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی۔ جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

مگر احسان کے معاملہ میں یہ دیکھا کہ یاد خدا اور خوف خدا تو الگ رہے احسان اور اس کے ماں باپ نشۂ مسرت میں ایسے مست ہوئے کہ اپنی ہی یاد نہ رہی اور ڈاکٹر کی یہ ہدایت کہ دو سال بعد پھر یہ دورہ ہو گا اور ایک تندرست اور جوان انسان کے خون سے عمل جراحی کی ضرورت ہو گی بالکل بھول بسر گئے۔ نکاح کو ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ احسان پھر پھوڑے کی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اور ماں باپ کی آنکھیں کھلیں۔ شروع شروع میں تو اس خیال سے تسکین تھی کہ ثریا اپنا خون نذر کرے گی۔ اور شوہر کو موت کے منہ سے بچالے گی مگر گھنٹوں گذرے پہر گذرے دن گذرے احسان نے اشارہ سے توقیر نے کنائے

سے کہا مگر اپنے سے خوب خدا، ثریا کی جان کیا مفت کی تھی کہ وہ شوہر پر قربان کر دیتی۔ اس نے اس کان سُنا۔ اور اس کان اڑا دیا۔ اور جب ساس اور خسر دونوں مایوس ہو گئے تو ہر وقت ثریا کے سامنے فاطمہ کی تعریفیں کرنی شروع کیں۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو احسان کا ترکہ ثریا کے نام لکھنے کی تجویز ہوئی۔ یہ افسوں بھی کارگر نہ ہوا تو منتوں اور خوشامدوں کی باری آئی۔ ثریا سمجھ تو اوّل ہی روز گئی تھی۔ جب سارا گھر ایک مُنہ ہو گیا۔ تو اس نے ایک روز ساس سے تو نہیں ایک مغلانی سے کہہ دیا:۔

"فاطمہ بے وقوف تھی۔ اگر اس نے غلطی کی تو میں ایسی غلطی کیوں کروں میں نے مہینہ بھر میں کیا دیکھ لیا کہ اپنی جان کھو دوں۔ مجھے ترکہ ورثہ کی ضرورت نہ مال متاع کی۔ اگر تقدیر میں بیوگی ہی لکھی ہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ جب ڈاکٹر نے احتیاط بتا دی تھی۔ تو کیوں نہ کی۔ مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ رکھیں"

آج احسان اور اس کے ماں باپ کو معلوم ہوا کہ ہر بیوی فاطمہ نہیں ہے تمام شہر میں اعلان کیا ہزاروں روپے کے وعدے کئے جائداد پیش کی گاؤں نذر کئے۔ مگر کس کی جان مفت کی تھی۔ ایک بھی رضا مند نہ ہوا۔

ماں باپ کا اضطراب پہلے سے زیادہ اور بے تابی کی یہ کیفیت تھی کہ ماں کلیجہ پر گھونسے مارتی تھی اور باپ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا۔ توقیر کا سکون ختم ہوا۔ اس وقت اس کی یہ حالت تھی کہ کڑاکے کے جاڑے میں ننگے سر ننگے پاؤں صحن میں ٹہلتی تھی کچھ خیال آیا اور کمرہ میں جاکر بچے کو دیکھا۔ اس کے قدموں پہ آنکھیں ملیں۔ دل بھر آیا۔ اور روتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کو اس وقت یقین تھا کہ جو مظالم میں نے لاوارث فاطمہ پر توڑے اُن کا بدلہ قدرت مجھ سے اس صورت میں لے رہی ہے وہ سوچتی تھی جاؤں فاطمہ کے آگے روؤں اور ہاتھ جوڑ کر کہوں۔ خدا کا واسطہ معاف

کرنا۔ مگر پھر خیال آیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ جان پر آبنی۔ اب بے سود اور بے کار۔ آج اتنی دنیا بھری پڑی ہے۔ اور کوئی کام آنے والا نہیں۔ کون اپنی جان دے۔ بے شک فاطمہ تو تو گور تھی اور ہے۔ اسی طرح دیوانوں کی طرح بھٹکتی ہوئی پھر بچہ کے پاس گئی۔ تو احسان نے ماں کو اپنے پاس بُلایا اور کہا۔

"یہ میری زندگی کے آخری سانس ہیں۔ اور گو تکلیف نے جان پر بار کھی ہے مگر عمر گذشتہ کے تمام اعمال ایک ایک کر کے آنکھ کے سامنے آرہے ہیں۔ میں اس ظلم کے خیال سے لرز رہا ہوں، جو میں نے اپنی عزیز بہن فاطمہ پر توڑے۔ میں مرد تھا۔ وہ عورت میں مال دار تھا وہ فقیر میں ماں باپ والا تھا۔ وہ لاوارث۔ میں نے موت سے غافل ہو۔ خدا کو فراموش کیا اور بے گناہ بچی کو تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا اماں جان کیسا نازک وقت آگیا۔ آنکھ بند ہونے کی دیر ہے۔ قبر کا ہولناک گڑھا ہوگا۔ اندھیرا ہوگا۔ تنہائی ہوگی۔ اور میں بے یار و مددگار اپنے جرائم کا ذمہ وار! وہ بار اس کا روپیہ، وہ زندگی اس کا نشہ، وہ جوانی اس کا جوش اس وقت سب ختم ہوئے۔ مر رہا ہوں، میرے اعمال موجود ہیں۔ فاطمہ زندہ ہے۔ اُس کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں نے کیا کیا اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہ کیسی رہی دنیا واقف ہے۔ زندگی کا ہر ذرہ اس پر رحمت اور مجھ پر لعنت برسائے گا۔ ہائے جان نکلی کیا کروں۔ ارے مجھ کو بچاؤ۔" چند لمحے خاموش رہا پھر کہا۔

"میری پیاری اماں جان! خدا کا واسطہ صرف ایک کام کیجئے میری ٹوپی لیجائیے اور اس انسانی حُور کے قدموں میں ڈال کر عرض کیجئے کہ بزرگوں کی پاک ارواح کا صدقہ مجھ ظالم نابکار کے قصور کو معاف کر۔ تو شریف ہے۔ میں ذلیل تو انسان ہے۔ میں جانور۔ صدقہ سادات کے خون کا طفیل اپنے کرم کا۔ اُس کو جو اپنی انسانیت کا مزہ چکھ کر اس وقت تیرے قدموں میں گرتا ہے۔ معاف کر دے۔ ایک

پھوڑے نے میری زندگی بے کار کردی، مگر یہ تمہید ہے۔ اس عذاب کی۔ دیباچہ ہے اس سزا کا۔ ابتدا ہے اس قہر کی جو مجھ پر نازل ہونے والا ہے"۔

اتنا کہہ کر احسان نے ماں کی طرف دیکھا۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ اور اپنی ٹوپی اٹھا کر اس کو دی اور کہا "بلّٰہ اماں جان جلدی کیجئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے پرواز روح سے پہلے اگر میں سُن لوں کہ سیدانی نے میرا قصور معاف کیا۔ تو اطمینان سے مروں اور ہنستا ہوا رخصت ہوں" توقیر بچے کے ہاتھوں کو چمٹ گئی پیار کیا۔ اور رو رو کر کہنے لگی "اے احسان میرا دل کمزور ہے اور تمام عمر کی کمائی صرف تو ہے۔ میرا کلیجہ شق ہوتا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ میرے زخم پر نمک نہ چھڑک"

احسان "آپ کی بہو کہاں ہیں؟"

توقیر "وہ کل ہی چلی گئی میں نے ہر چند روکا۔ تمہارے ابا جان نے بہتیرا کہا مگر وہ نہ ٹھہری۔ شام تمہارے خسر آئے۔ میرا خیال تھا۔ تم کو دیکھنے آئے ہیں مگر وہ بیٹی کو لے کر چلے گئے۔ صرف اتنا کہا "آپ کو کیا خبر۔ میری بچّی کی جان پر خود آ بنی ہے۔ آپ بیمار ہے۔ اور میں سخت پریشان ہوں"۔ اتنا سنتے ہی احسان چیخ اٹھا اور کہا "اللہ اللہ"، "اماں جان خدا اپنی قدرت کے نمونے دکھارہا ہے۔ میری آنکھیں نکاح کی وہ وقت بھی دیکھ چکی ہیں کہ منکوحہ میرے پھوڑے پر خود قربان ہوئی ہے۔ اور آج یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ ثریا اتنی بھی روادار نہ ہوئی کہ میں اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا سے رخصت ہوں"۔ یہ کہہ کر احسان نے پھر ایک چیخ ماری اور کہا "اللہ اللہ"!"

توقیر بچے کو گلے سے لگائے ہوئی تھی۔ اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتی تھی۔ اس کے منہ پر منہ رکھتی تھی۔ اور روتی تھی کہ احسان نے پھر کہا:۔

"اچھی اماں جان! خدا کا واسطہ۔ فاطمہ کی خدمت میں جائیے۔ اور میرا پیام پہنچائیے"۔

(۲۳)

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ فاطمہ نماز پڑھ کر اٹھ رہی تھی کہ حفیظ مسجد سے نماز پڑھ کر آیا اور کہا "بیگم تم نے تو اچھا جادو کیا کہ مجھے اب بغیر نماز پڑھے چین ہی نہیں پڑتا۔"

فاطمہ "تم نے میری درخواست قبول کی تمہارا کرم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تم خدا کی طرف بالشت بھر بڑھے وہ گز بھر بڑھا۔ ابھی تم نے پوری طرح غور نہیں کیا کہ وہ کیا ہے اور تم کیا۔ غور کرنے کی دیر ہے۔ وہ لطف آئے گا کہ عمر بھر یاد کرو گے؟"

حفیظ "سنا ہے۔ بھائی احسان کی حالت زیادہ خراب ہے۔"

فاطمہ "میں نے تو آج ہی سنا ہے۔ کہتے ہیں وہ دورہ پھر ہوا۔"

حفیظ "اب بھی خون دینے کو تیار ہو۔"

فاطمہ "ہاں اگر تم کہو تو اب بھی۔"

حفیظ "اگر خدانخواستہ پوری قربان ہو گئیں۔"

فاطمہ "میں تو تعمیل حکم کروں گی، قربان ہوں گی تو اس حکم پر جس کا حکم اسی کی جان۔"

حفیظ یہ سن کر آگے بڑھا اور محبت کا سچا ہاتھ فاطمہ کے سر پر رکھا اور کہنے لگا۔ "خدا تمہاری عمر دراز کرے مجھے تم سے یہی امید ہے میں تو ہنس رہا تھا کہو اماں جان سے اس وقت کیسے ملے ہوا۔"

فاطمہ "نہیں ملتیں اور یہ پہلا موقع ہے کہ انھوں نے میری دل شکنی گوارا کی۔"

حفیظ "تم کیا چاہتی ہو؟"

فاطمہ "صرف اتنا کہ ان کا سر بجائے مغلانی کے میں اپنے ہاتھ سے گوندھوں تم سفارش کردو۔"

میاں بیوی کی گفتگو ہو رہی تھی کہ بلقیس بھی ادھر آ گئی۔ تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً دروازہ میں رونے پیٹنے کی آواز آئی سب گھبرا گئے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سے تو فیر آتی دکھائی دی۔ وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ چچی کی صورت دیکھتے ہی فاطمہ اٹھ کھڑی ہوئی

اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خاموش کھڑی تھی۔ قدرت نے عجیب سماں دکھایا اور یہ وہ درد انگیز منظر تھا۔ جس کو دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور ماننا پڑتا تھا کہ کارخانۂ حیات کے ہر تغیر کی تہ میں ایک زبردست طاقت کام کر رہی ہے۔ وہ توقیر جس نے فاطمہ کو ایک ذلیل سے ذلیل جانور کی بھی وقعت نہ دی جس کو دنیا کی بدترین ہستی سمجھا۔ اس وقت اس کے سامنے بے تابانہ آئی اور اس کے قدموں میں گری اور کہا۔

" بیگم! ناشاد، نامراد ماں اس بچہ کا پیام لے کر آئی ہے۔ جو اس دنیا میں چند لمحہ کا مہمان ہے۔ اس کی عمر پوری ہوئی۔ اس کا وقت آخر ہے اور آج میں اور وہ دونوں اس ظلم کا اقرار کرتے ہیں جو ہم نے تجھ بے گناہ پر ڈھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو اور بلقیس دونوں انسان تھے شریف تھے۔ مگر میں اور احسان دونوں رذیل کمینے تھے۔ میں احسان کی، ہائے ہائے اس احسان کی جواب دم توڑ رہا ہے۔ یہ ٹوپی لائی ہوں اور تیرے قدموں میں ڈال کر کہتی ہوں بیبا لے بیگم! حفیظ کا صدقہ احسان کو معاف کر!"

فاطمہ کا دل کمزور تھا وہ توقیر کی گریہ وزاری سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ آنسو بہہ رہے تھے۔ آنسوؤں کی لڑیوں سے اس کا استقبال کیا۔ وہ قدموں میں گری تو اس کا سر ہاتھ پر لیا اور کہنے لگی "چچی جان میں غیر تو نہیں ہوں جو کچھ ہوں وہ آپ کی۔ آپ رذیل ہیں تو میں پہلے۔ خدا بھائی احسان کی عمر دراز کرے میں کنبہ بھر کی خدمت گزار ہوں۔ آپ نے احسان کی معافی کے واسطے وہ حوالہ دیا کہ اس نام پر ہزار دفعہ قربان۔ میں نے میرے خدا نے احسان کا قصور معاف کیا۔ مگر آپ نے جس نام کا واسطہ دیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ حق رکھتا ہے"۔ اتنا کہہ کر فاطمہ نے حفیظ کیطرف دیکھا، اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد فاطمہ نے کہا "خدا آپ کی مامتا ٹھنڈی رکھے اس وقت بھی اسکے واسطے تیار ہوں کہ اگر حفیظ کا ادنیٰ اشارہ ہو تو ایک جان کیا ہزار جانیں حفیظ پر قربان کر دوں۔ چچی جان! جو نام آپ نے لیا۔ وہ میرے مالک، میرے سر تاج میرے آقا کا ہے۔ آپ نے یہ واسطہ دیکر میرا دل دہلا دیا۔ اس سلسلے میں کچھ اور خدمت کرنی چاہتی

ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کو قبول فرماکر ممنون کریں گی۔ وہ چھوٹی پیالی جو میں نے میز پر رکھی خون سے بھر گئی۔ اور خون بند نہ ہوا تھا تو اس خیال سے کہ میرے کپڑے افشائے راز نہ کریں۔ میں نے آپ ہی کے ہاں سے ایک گلاس اٹھا کر لگا لیا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت خون رکا ہے گلاس میں اچھی خاصی تعداد خون کی جمع ہو گئی تھی یہ گلاس آپ کی بڑی الماری کے پیچھے طاق میں رکھا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اب تک محفوظ ہے خدا آپ کو اور بھائی احسان کو خوش رکھے۔ آپ جائیے اور اس کا استعمال کیجئے۔ میں اس کے صلہ میں آپ سے صرف اس دعا کی ملتجی ہوں کہ خدا میرے آقا کو ہر وقت نظر بد سے محفوظ رکھے۔"

مسرت کی انتہائی کیفیت میں اس وقت توقیر نے پھر ایک چیخ ماری اور کہا:-

"اس ظلم و ستم پر بھی احسان کو زندگی عطا کرنے والی فاطمہ اور صرف فاطمہ ہے۔"

حفیظ اور بلقیس دونوں ماں بیٹے خاموش کھڑے تھے اور توقیر بلبلا بلبلا کر فاطمہ کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ دروازے میں سے ایک عورت دیوانہ وار آتی ہوئی دکھائی دی اور آتے ہی فاطمہ کے قدموں پر گری اور کہا "میرا ظلم پہاڑ ہے۔ میرا فریب قیامت! میرا عمل مصیبت اور میرا دھوکا آفت۔ فاطمہ میں وہ ناہنجار ثریا ہوں جس نے دھوکا دے کر تیرا ہار قبضہ میں لیا اور احسان تک پہنچایا جو سفوف تو نے نہانے کیواسطے دیا تھا۔ میں نے اپنی خوشی میں مست ہو کر پھینک دیا اور نہ نہائی۔ تین دن سے میرے تمام جسم پر دانے نکل رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں یقیناً اس مرض میں گرفتار ہوئی فاطمہ لِلّٰہ وہ سفوف تھوڑا سا دے اور مجھ کو اس مصیبت سے بچا۔"

فاطمہ اسی وقت دوسرے کمرے میں گئی اور پڑیا لا کر ثریا کو دی اور کہا "ثریا جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ یاد دیری باتیں فقط دل خوش کرنے کی ہوتی ہیں۔ پیاری حقیقت حقیقت ہی ہے۔ جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔ صداقت کسی نہ کسی موقعہ پر اپنا رنگ دکھاتی ہے مجھے معلوم ہے جو تو نے کیا اور جانتی ہوں جس وجہ سے کیا۔" یہ عجیب وقت تھا۔ کمرے کے

تمام آدمی دنگ تھے کہ کس طرح قدرت نے سچائی کا بول بالا کیا اور وہ ایسی زبردست طاقتوں کو مظلوم کے قدموں میں لا ڈالا۔ توقیر حیرت سے ثریا کا منہ تک رہی تھی۔ ثریا تعجب سے ساس کی حالت پر غور کر رہی تھی کہ مغربی دیوار پر ایک ایسی روشنی نمودار ہوئی جس نے تمام کمرہ جگمگا دیا۔ بلقیس ڈری فاطمہ ششدر رہ گئی۔ توقیر حیران تھی ثریا پریشان تھی کہ دیوار میں ایک مجسمہ نمودار ہوا۔

یہ علم النفس کا ایک مسئلہ ہے کہ بعض حالت میں وہ کیفیت جو نیند میں دماغ پر طاری ہوتی ہے۔ عالم بیداری میں بھی گذر جاتی ہے۔ خدا معلوم خواب تھا۔ حقیقت تھی یا کیا تھا مجسمہ فاطمہ کے باپ حسن کا تھا جس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے ہاتھ سے بلقیس کے قدم چھوئے اور الٹا ہاتھ فاطمہ کے سر پر رکھ کر کہا۔ "توقیر اس مینڈکی کی طرح جس کے سامنے صرف کنواں ہوتا ہے تو اس وقت فقط احسان کی موت اور اس کی مصیبت سے متاثر ہے تجھے یہ نہیں معلوم کہ عالمِ ارواح میں تیرے اعمال و افعال پر کیا ہو رہا ہے۔ توقیر تو نے کونسا ظلم تھا جو فاطمہ پر نہ توڑا کیا تو اس کے لئے تیار تھی کہ جس طرح تو نے حقیقی بھتیجی او سنگدل توقیر! بن باپ کی بچی کا نکاح تڑوا دیا اس طرح تیرا شوہر اور میرا بھائی حسین تجھ کو گھر سے باہر نکال دیتا؟ کیا تو سمجھتی ہے کہ ابھی تجھ کو اور احسان کو اس دنیا میں جو تمہاری ناپاک ہستیوں سے پناہ مانگ رہی ہے۔ زندہ رہنے کا حق ہے! توقیر تو نے میری بچی کو الٹی چھری سے ذبح کیا میں اور میرے ساتھ تمام خاندان کی روحیں کانپ اٹھیں جب وقت تیری صلاح و مشورہ سے احسان نے فاطمہ کو طلاق دی، عالم حیات و ممات دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں جو تو کر رہی تھی وہ سب فاطمہ پر نہیں ہمارے دل پہ گزر رہی تھی۔ تیری زندہ آنکھیں نئے نئے ظلم ڈھا کر ہنسیں اور ہمارے مردہ دل ڈھاڑیں مار مار کر روئے او شقی القلب بے رحم! رات رات بھر اور دن دن بھر ہماری آنکھوں سے خون کے آنسو برسے مگر تیرے دل پر چوٹ نہ لگی توقیر تجھ کو یاد ہوگا جس وقت موت نے میری حالت خراب کی اس وقت میں نے صرف

مجھ کو بلاکر اپنے کلیجہ کا ٹکڑا تیرے سپرد کیا اور منہ سے کہا کہ اس کا وارث تیرے سوا کوئی نہیں اس کو بہو نہیں لونڈی اور بھتیجی نہیں ماما سمجھیو۔ یاد کر تو نے یہ درخواست منظور کی اور وعدہ کیا کہ احسان پیچھے اور فاطمہ پہلے۔ اس نے اپنی شرافت کے جو جوہر دکھلائے وہ آج دنیا اور دین دونوں میں چمک رہے ہیں، مگر تو نے او احسان فراموش، محسن کش، بے وفا اور سنگدل توفیر! تو نے نسوانیت کی جو شان دکھائی وہ سننے والوں کے دل اور دیکھنے والوں کی آنکھوں سے فراموش نہیں ہو سکتی! میں نے مانا کہ فاطمہ تیرا اور احسان کا قصور معاف کر چکی مگر تو نے فاطمہ کے علاوہ کئی دل توڑے ہیں۔ تیرے مظالم پر فرشتے کانپتے ہیں اور ہم منتظر ہیں اس وقت کے جب تیرا ناپاک جسد خاکی فنا ہو کر تیری گندہ روح عالم بالا پر پہنچے۔ توفیر! تو اندازہ نہیں کر سکتی کہ تو نے کیا کیا غضب ڈھائے، احسان کا پہلی دفعہ بچنا محض تیری آزمائش تھی اور گو آج فاطمہ نے پھر تجھ پر کرم کیا۔ لیکن توفیر! جس کا کوئی وارث نہیں اس کا وارث بڑا زبردست ہے۔ وارث والے سے نہ ڈر بے وارث سے ڈر! میں تجھے بتائے دیتا ہوں کہ جو کچھ تو نے کیا اس کی سزا اسی دنیا میں بھگتے گی۔ توفیر! وہ وقت آئے گا اور ضرور آئے گا کہ تجھے احسان کا جنازہ دیکھنا پڑے گا۔ تیری حالت بدلے گی۔ تیرا راج ختم ہو گا اور سامنے ہے وہ دن بھی جب بھیک کا پیالہ تیرے ہاتھ میں ہو گا اور تیرے جسم میں کوڑھ ہو گی یہ بد دعا نہیں حقیقت ہے اور صرف اس لئے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ معصوم بچی پر ظلم ڈھانا آسان نہ تھا۔ تیرے حمایتی بہت تھے جن کی حمایت ختم ہوئی اس کا حمایتی صرف ایک تھا۔ جس کی حمایت اب شروع ہوئی اور تجھ کو بتا دے گی کہ مظلوم اور ظالم کا فیصلہ روز جزا پر نہیں دنیا ہی میں ہوتا ہے۔

الامان الحفیظ! توفیر الامان الحفیظ!! وہ بچی جو تیرے لال پر قربان ہوئی اس کی انسانیت اور شرافت کا یہی حق تھا کہ اس دنیا میں تیری آنکھوں کے سامنے دو دو تین تین وقت بھوکی رہے، روزہ پر روزہ رکھے اور پانی کے گھونٹ سے کھولے، وہ بھوکی سوئے

اور بھوکی اٹھے اور تو سیروں کھانا برباد کرے۔ مگر ایک نوالہ اس کی تقدیر کا نہ ہو۔ فاطمہ تیری بہو تھی۔ تیری ہزار برس کی نیو تھی۔ اگر کچھ نہیں تو تیرے بیٹے کے نکاح میں تھی۔ فقیر تھی کنگال تھی، مگر تیرے لال کے عقد میں تھی۔ آخر کس جرم میں کس خطا میں تیرے ہاتھوں اس نے وہ دن دیکھے۔ اس پر وہ راتیں گزریں جن کے خیال سے کلیجہ لرزتا ہے۔ تو فقیر تو نے احسان کو آج تک مردانہ میں نہ سلایا اور میری بچی ڈھنڈھار گھر میں تن تنہا سوئی! تو عزیز نہ سہی اپنی تھی اور میری فاطمہ تیرے پاس امانت تھی!!"

"بلقیس! کس کا منہ ہے تیرے کرم کا شکریہ ادا کر سکے، اگر تیرا وجود نہ ہوتا تو تو قیر ثابت کر چکی تھی کہ عورت سے زیادہ روسیاہ ہستی دنیا میں نہیں، تو نے وہ کیا کہ خدا تیری عمر دراز کرے۔ جنت کی حوریں تیری زیارت کی مشتاق ہیں تو نے حفیظ سے فاطمہ کی چوکھٹ کا بوسہ دلوایا، میں آج عالم بالا سے تیرے پاؤں کا بوسہ دینے آیا ہوں!! میری دعا ہے کہ دنیا کی بہاریں تیرے ساتھ ہوں اور جو پودا تو نے چمنستانِ حیات میں لگایا یہ پروان چڑھے اور دونوں دولہا دلہن تیرا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔"

"میرے کلیجے کے ٹکڑے فاطمہ میرے قریب آ کہ سینے سے لگاؤں حق یہ ہے کہ تو نے دنیا کو دکھا دیا کہ شریف بچیاں کس طرح شوہروں پر قربان ہوتی ہیں۔ تیری تمام تکلیفیں جو تو نے دنیا میں اٹھائیں تمام مصیبتیں جو تو نے بھگتیں محض ایک آزمائش تھیں اور آج وہ سب ختم ہو چکیں۔ مگر بساطِ حیات پر جو رنگین پھول تو نے کھلا دیئے وہ کبھی مرجھانے والے نہیں۔ فاطمہ تو نے سادات کے خون کی لاج رکھ لی اور بتا دیا کہ مسلمان بیوی کے کیا معنی ہیں! میری آنکھوں کی ٹھنڈک! میرے اور قریب آ تیری پیشانی کو بوسہ دوں، تیری مصیبتیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں، جس صبر سے تو نے مظالم کی برداشت کی وہ بے مثل ہے۔ میری دعا ہے تو اس دنیا میں اطمینان کی زندگی بسر کرے میں جاتا ہوں مگر یہ کہے جاتا ہوں کہ "فاطمہ! زندگی کی کامیابی شوہر کی رضامندی میں پوشیدہ ہے۔"

ختم شد